جِنّات کے دربار میں

جُرم اور سُراغ رسانی کی چار سچّی کہانیاں



احمد یار خان

جِنّات کے دربار میں

جُرم اور سُراغ رسانی کی چار سچّی کہانیاں

احمد یار خان

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی تفتیشی کہانیوں کا ساتواں مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں چار طویل کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔

احمد یار خان کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ جرم و سزا، تفتیش اور سراغ رسانی میں محترم احمد یار خان کا نام سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کہانیوں میں مصنّف کی دوسری کہانیوں کی طرح جرم کا صرف ارتکاب نہیں دکھایا گیا بلکہ ہر کہانی میں جرم کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح ہر کہانی صرف جرم و سزا کی نہیں بلکہ چار دیواری کی دنیا کی بھی کہانی ہے۔

قتل جیسے بھیانک جرم کرنے والوں میں کوئی ایک بھی جرائم پیشہ نہیں۔ سب بے ضرر سے افراد ہیں۔ ان کے ذہنوں سے معمولی سے جرم کا بھی کبھی گزر نہیں ہوا تھا مگر ان پر ایک لمحے کا پاگل پن طاری ہوا اور قتل کی ایسی واردات ہو گئی کہ قاتل کا سراغ لگانا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ اس لمحے کے پیچھے بڑی لمبی لمبی داستانیں ہیں جنہوں نے بے ضرر سے افراد کو اس لمحے تک پہنچا دیا جہاں انسان اپنی جان لے لیتا ہے یا کسی کی۔ جب یہ لمحہ گزر جاتا ہے تو ان حقیقی ڈراموں سے پردہ اٹھتا ہے جو آپ کو پوری تفصیل سے سناتے جا رہے ہیں۔

مصنّف کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ آپ پڑھتے وقت محسوس کریں گے جیسے آپ فلم دیکھ رہے ہیں یا جیسے ہر واردات اور تفتیش آپ کے سامنے ہو رہی ہے۔ ہر کہانی پڑھ کر آپ کو اپنے ہوش و حواس میں آنے میں خاصی دیر لگے گی۔

عنایت اللہ

مدیر: ماہنامہ "حکایت" لاہور

فہرست

ایک خط ایک جذبہ

ہندوؤں کے اُس علاقے میں جرائم بہت ہی کم ہوتے تھے۔ آج کل کی طرح ہر روز چوریوں کی بھر مار نہیں تھی۔ کبھی کبھار نقب لگتی یا ڈاکہ پڑا کرتا تھا۔ دیہاتی علاقے میں رہزنی اور قتل کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ میں ایک قصبے کے تھانے کا انچارج تھا۔ یہ ہندوؤں کا قصبہ تھا۔ چند ایک گھرانے سکھوں کے اور ان سے بھی کم مسلمانوں کے تھے۔ مسلمانوں کی یہاں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ جرائم کے لحاظ سے یہ قصبہ پاک صاف تھا۔ اس قصبے میں جب قتل کی ایک واردات ہوگئی تو یوں پتہ چلتا تھا جیسے خوف و ہراس سے سارا قصبہ مر گیا ہو۔ قتل ہونے والا معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ دولت مند ہندو تاجر تھا۔ سیاست میں بھی اُس کا عمل دخل تھا اور سرکاری حلقوں میں بھی وہ جانا پہچانا جاتا تھا۔ قصبے کے ہندوؤں کا وہ سرگرم لیڈر رہا تھا۔

وہ کوئی بوڑھا آدمی نہیں تھا۔ اُس کی عمر تیس سال سے ایک آدھ

سال اُوپر ہو گی۔ وہ روایتی ہندوؤں کی طرح دھوتی نہیں باندھتا تھا۔ اُس کا پیٹ بڑھا ہوا نہیں تھا اور ہندو بنیوں کی طرح اُس کا جسم موٹا بھدا نہیں تھا۔ وہ خوبرو جوان تھا۔ قدبُت اچھا تھا۔ مسلمانوں جیسا لباس پہنتا تھا۔ میں نے اُسے اکثر دیکھا تھا۔ اگر میں اُسے نہ جانتا تو اُسے مسلمان سمجھتا۔ وہ ذہنی اور نظریاتی لحاظ سے کٹر ہندو تھا اور مسلمانوں کے خلاف اُس کا دل تعصّب سے بھرا ہوا تھا۔ البتہ لباس اور عادات کے لحاظ سے وہ ترقی پسند ہندو تھا۔ وہ تھرڈ ایئر تک پڑھا تھا۔ بی۔ اے اس لیئے نہ کر سکا کہ اُس کا باپ مر گیا تو کاروبار سنبھالنے والا کوئی نہ رہا۔ یہ دُور دُور تک پھیلا ہُوا آڑھت کا کاروبار تھا۔ مقتول تعلیم ترک کر کے آ گیا اور اُس نے تجارت سنبھال لی۔ اس کے بعد اُس نے شادی کی۔ اُس کے دو بچے تھے۔

رات غالباً دس گیارہ بجے کے درمیان کا وقت تھا۔ دو سرکردہ ہندو تھانے میں یہ اطلاع لے کے آئے کہ ایک اندھیری گلی میں سیٹھ راجیش مرا پڑا ہے۔ ان ہندوؤں کے ساتھ غریب سا ایک آدمی تھا جس نے لاش دیکھی اور ان ہندوؤں کو اطلاع دی تھی۔ میں یہ دعائیں کرتا لاش تک پہنچا کہ یہ قتل نہ ہو، راجیش حرکت قلب بند ہونے سے مر گیا ہو۔ ہندوؤں کی آپس میں کاروباری رقابت ہوا کرتی تھی، قتل تک کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ البتہ یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ اُس نے کسی سکھ یا مسلمان سے دشمنی مول لے لی ہو گی۔ مسلمان اور سکھ انتہائی کارروائی کرنے والی قومیں ہیں۔

لاش کے اردگرد تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ کسی ایک نے لالٹینیں اُٹھا رکھی تھیں۔ مقتول کے لواحقین بھی آ گئے تھے۔ لاش کی آنکھیں اس طرح کھلی تھیں جیسے ڈھیلے باہر آ جائیں گے۔ زبان باہر آ کر دانتوں کے درمیان آتی ہوئی تھی۔ اسی سے میں نے رائے قائم کر لی کہ گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ میں نے ایک لالٹین پکڑ لی۔ لاش کی گردن دیکھی۔ گردن کے گرد جمے ہوئے خون کا نشان بڑا ہی صاف تھا۔ اسے گلے میں پھندا ڈال کر مارا گیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اسے یہیں مارا گیا ہے یا کہیں اور پھانسی دے کر یہاں پھینکا گیا ہے۔

ہجوم میں سے مجھے ایک آواز سنائی دی — "یہ چھی چھی چھی۔ لاش کو مسلمان ہاتھ لگا رہا ہے۔"

میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کا عادی تھا لیکن اس آواز نے مجھے باؤلا کر دیا۔ میں پاؤں پر بیٹھا لاش کو دیکھ رہا تھا۔ میں اُٹھا اور غصّے سے کہا — "ہم اِس لاش کو ابھی چیریں پھاڑیں گے۔ اسے بھنگی اُٹھا کر مُردہ خانے سے باہر پھینکیں گے۔ تمہیں اس کی پاکیزگی کا اتنا خیال ہے تو مجھے لکھ دو کہ یہ قتل نہیں ہوا۔ میں چلا جاتا ہوں" — میں نے گرج کر کہا — "کس نے کہا تھا لاش کو مسلمان ہاتھ لگا رہا ہے؟ آگے آؤ۔"

ہجوم پیچھے ہٹنے لگا۔ ہندو سامنے آنے کا قائل نہیں۔ سرکردہ ہندو جو تھانے آتے تھے میرا غصّہ ٹھنڈا کرنے لگے۔ میں نے انہیں لاش تھانے اُٹھا لے چلنے کو کہا۔

لاش، ایک بال اور لپ سٹک

میں نے تھانے میں لاش کا منظری معائنہ کیا۔ گردن کے گرد پھندے کا نشان صاف تھا۔ مقتول نے گرم کپڑے کی قمیض اور اسی کپڑے کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ قمیض کے بٹن چاندی کے تھے۔ یہ سٹڈ بٹن تھے۔ سب میں سے چاندی کی زنجیر گزری ہوئی تھی۔ اُس دور میں اس قسم کے بٹن استعمال ہوتے تھے۔ کالر سے نیچے والے بٹن اور اس کی زنجیر کے ساتھ ایک بال اُلجھا ہوا تھا۔ یہ ٹوٹا ہوا مگر لمبا بال تھا۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ عورت کا بال ہے۔ بٹن سے کچھ آگے اور بائیں طرف مجھے ایک داغ کا شک ہوا۔ قمیض کا رنگ سلیٹی تھا۔ میں نے داغ کو غور سے دیکھا۔ یہ سُرخ تھا اور یہ لپ سٹک کا ہی ہو سکتا تھا۔ بہت مدھم تھا۔ میں نے اتنی زیادہ اس داغ کے قریب آنکھیں کیں کہ میری ناک قمیض سے جا لگی۔ مجھے گلاب کے عطر کی خوشبو آئی۔

میرا ایس۔ اے۔ آئی عثمان نام کا ایک مسلمان تھا۔ پہلے بھی ایک کہانی میں اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ بہت دلیر اور ذہین جوان تھا۔ اگر زندہ رہتا تو انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچتا لیکن ڈاکوؤں کے ساتھ ایک جھڑپ میں وہ مجھے بچاتے ہوئے مارا گیا تھا۔ اس کی کہانی سُنا چکا ہوں وہ یاد آتا ہے تو آج بھی میرے آنسو نکل آتے ہیں۔ وہ زندہ دل بلکہ

عیاش طبیعت کا مالک تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ بھی سُونگھے۔ اُس نے سُونگھا تو نشے کی سی کیفیت میں آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے پُوچھا ــ "یہ گلاب کے عطر کی خوشبو نہیں ہے؟"

"نہیں!" ــ اُس نے مخمور لہجے میں کہا ــ "یہ کسی حسینہ دلربا کی بُو ہے ملک صاحب! یہ ارمان بھرے رُومانوں کی بُو ہے" ــ میں نے اُس کے سر پہ تھپیڑ مار کر ارمان بھرے رومانوں سے بیدار کیا تو اُس نے ہنس کر کہا ــ "جی۔ یہ گلاب کا عطر ہے۔ یہ لپ سٹک کا ہلکا سا داغ ہے اور یہ اُسی کا بال ہے جو گلاب کا عطر اور لپ سٹک لگاتی ہے .... ملک صاحب!" ــ اُس نے حسبِ عادت زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہُوئے کہا ــ "یہ تفتیش مجھے دے دیں۔"

رومان پرستی عثمان کی کمزوری تھی۔ وہ جلدی ہی سنجیدہ مُوڈ میں آ گیا۔ میں نے مقتول کی قمیض آگے سے پھاڑ کر اُتار لی اور باقاعدہ کاغذی کارروائی کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ میں نے آپ کو متعدد کہانیوں میں بتایا ہے کہ عام آدمی کو نظر نہ آنے والی چیزیں پولیس کے لئے بڑی قیمتی ہوتی ہیں۔ لپ سٹک کا داغ اتنا مدھم تھا کہ میرے سوا اور کوئی نہ دیکھ سکتا۔ میں نے قمیض کو ہر جگہ سے سُونگھا۔ عطر کی خوشبو صرف وہاں تھی جہاں کسی عورت کا بال اور سُرخ داغ تھا۔ یہ بال اور لپ سٹک مقتول کی اپنی بیوی کی بھی ہو سکتی تھی۔ لاش کو اچھی طرح دیکھا، کہیں کوئی چوٹ یا زخم نہیں تھا۔ پھر میں نے اپنے ایک تجربے کی بنا پر

لاش کی اُنگلیاں اور ناخن دیکھے۔ ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ درمیانی انگلی اور اس کے اور انگوٹھے کے درمیان والی انگلی کے ناخنوں کے اندر کی طرف اور انگلیوں کے سروں پر خون جما ہوا تھا۔ اس سے یہ سراغ ملا کہ جب اس کی گردن کے گرد پھندا ڈال کر کسا گیا تو اُس نے پھندا ڈالنے والے کے ہاتھ یا بازو پر آزاد ہونے کے لئے ناخن مارے اور اُس کی کھال چھیل دی۔ مجھے ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ پھندا کیسا تھا۔ یہ رسہ تھا یا چھوٹی سی رسی تھی۔ بہر حال یہ یقین تھا کہ ہاتھوں سے گلا نہیں گھونٹا گیا۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔ سرکاری ہسپتال قریب ہی تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ عثمان کو ساتھ بھیجا تاکہ وہ ڈاکٹر کو جگا کر فوراً پوسٹ مارٹم کرائے۔ میں نے ابتدائی بیان لینے شروع کئے۔ جس آدمی نے لاش دیکھی تھی اُس سے بہت کچھ پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ جب اُس نے لاش دیکھی تو اُس نے پاس بیٹھ کر لاش کے مُنہ پر اور ہاتھوں پر ہاتھ رکھا جسم گرم تھا اس لئے وہ سمجھا کہ وہ زندہ ہے۔ اُس نے ماچس جلائی تو لاش کا چہرہ دیکھ کر ڈر گیا۔ اُس نے مقتول کو پہچان لیا اور قریبی گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک آدمی باہر آیا۔ اُس نے لاش دیکھ کر شور مچا دیا۔ کئی لوگ نکل آئے۔ مقتول کے گھر اطلاع دی گئی۔ وہ چونکہ دولتمند تاجر اور لیڈر تھا اس لئے ہر طرف شور بپا ہو گیا اور یہ سرکردہ ہندو آگئے جو تھانے میں آئے تھے۔ وہ اب بھی تھانے کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ مقتول کے لواحقین بھی موجود تھے۔

لاش گرم ہونے سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ اسے ایک گھنٹہ پہلے قتل کیا گیا ہے۔ وہ ایک قصبہ تھا جہاں شام کے فوراً بعد دکانیں بند ہو جاتی تھیں اور لوگ جلدی سو جاتے تھے۔ موسم سردیوں کا تھا۔ لوگ گھروں میں دبکے ہوتے تھے۔ گلی اندھیری تھی۔ وہاں نو بجے یا اس سے ذرہ بعد قتل ہو جانا کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ جس آدمی نے لاش دیکھی تھی اُسے میں نے اس قابل نہ سمجھا کہ اس پر شک کیا جائے۔

اُسے باہر بھیج کر دونوں ہندوؤں کو اندر بلایا۔ اُنہوں نے بتایا کہ مقتول شام کے بعد اُن کے ساتھ تھا۔ مندر میں ایک میٹنگ تھی۔ یہ میٹنگ کوئی ایک گھنٹہ رہی، پھر سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مَیں نے اُن سے پُوچھا کہ انہیں یقین ہے کہ مقتول میٹنگ کے بعد اپنے گھر چلا گیا تھا؟ ان میں سے ایک نے ذرا سوچ کر کہا — "وہ ہم سے الگ ہُوا تو اُس کا رُخ اپنے گھر کی طرف نہیں تھا۔"

"آپ مجھے کوئی اشارہ دے سکتے ہیں کہ اور کس کے ساتھ اُس کی دوستی تھی؟" میں نے پُوچھا۔

"وہ تو ہر کسی کا دوست تھا" — ایک ہندو نے جواب دیا۔ اُس نے دوسرے ہندو کی طرف دیکھا۔ دوسرے نے اُس کی طرف دیکھا۔

انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اُس تھانیدار کے سامنے بیٹھے ہیں جو آنکھوں سے دل کی بات جان لیا کرتا ہے۔ مَیں نے اُنہیں کہا — "آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ مجھے ذرا سا بھی شک ہُوا کہ آپ

کچھ چھپا رہے ہیں تو آپ گھروں کو نہیں جا سکیں گے۔"

ہندو بڑی عیار اور مکار قوم ہے۔ وہ فوراً میرے آگے بچھنے لگے۔ ان کی حرکتیں خوشامدی درباریوں کی طرح تھیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ چھپانے کی کوئی بات نہیں۔ ایک سکھ کا نام لے کر اُنہوں نے بتایا کہ وہ اُس کے گھر جایا کرتا تھا۔ شاید اُدھر ہی گیا ہو گا۔ ان سے پوچھا کہ کسی کے ساتھ اس کی اتنی دشمنی تھی کہ قتل تک نوبت پہنچتی؟ مجھے جواب ملا کہ وہ ہر دلعزیز تھا۔ دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — ان سے کچھ اور معلومات لیں اور رخصت کر دیا۔

ایک بیوی اپنی ایک پرائی

مقتول کے لواحقین بھی آئے بیٹھے تھے۔ ان میں اس کا سسر بھی تھا اور اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی جس کی عمر بیس سال سے زیادہ تھی۔ میں نے سسر کو اندر بلایا۔ بوڑھے کی حالت بہت بُری ہو رہی تھی۔ اس کی بیٹی بیوہ ہو گئی تھی۔ اُس سے پوچھا کہ مقتول کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ روتا زیادہ اور باتیں کم کرتا تھا۔ میں نے اُس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کی بیٹی جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی ہے۔

"وہ تو اُس کی زندگی میں بھی بیوہ ہی تھی" — اُس نے روتے

ہُوئے کہا۔" اُس کا دل کہیں اور تھا۔ میری بیٹی تو بس اس کے بچوں کی ماں تھی۔"

میں چونکا اور اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے اُسی سکھ کا نام لیا جس کا ذکر دونوں ہندو کر گئے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس سکھ کی ایک جوان بیٹی شادی شُدہ ہے لیکن گھر بیٹھی ہُوئی ہے۔ خاوند کے ساتھ اس کی بن نہیں سکی۔ مقتول اُس سکھ کے گھر زیادہ جایا کرتا تھا۔ میں نے سُسر سے پُوچھا کہ اُسے کس طرح یقین ہے کہ مقتول سکھ کی اُس بیٹی میں دل چسپی لیتا تھا؟ وہاں جانے کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ سُسر کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا سوائے اس کے کہ مقتول اپنی بیوی سے کھچا کھچا رہتا تھا۔

جس سکھ کا اُس نے اور دونوں ہندوؤں نے نام لیا تھا وہ کوئی معمولی سا آدمی نہیں تھا۔ وہ بھی مقتول کی طرح بہت بڑا تاجر تھا۔ قلعے کی طرح اُس کی حویلی تھی۔ وہ بھی صرف تاجر نہیں بلکہ لیڈر قسم کا آدمی تھا۔ سرکاری اور سیاسی حلقوں میں اُس نے نام پیدا کر رکھا تھا۔ مقتول کا سُسر مجھے کوئی اور بات نہ بتا سکا۔ اُس کی بیٹی جب اُس کے پاس یعنی اپنے میکے جاتی تھی تو اپنے خاوند کی بے رُخی کی شکایت کیا کرتی تھی....

سُسر کو رخصت کر کے مقتول کے چھوٹے بھائی کو بلایا۔ اُس نے بھی کہا کہ مقتول کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ سکھ کی دوستی کے متعلق اُس نے بتایا کہ سکھ کا ایک جوان اور شادی شُدہ بیٹا ہے۔ مقتول کی زیادہ دوستی اُس

کے ساتھ تھی۔

"تمہارے بھائی اور بھابی میں کبھی لڑائی جھگڑا ہوا تھا؟" — میں نے پوچھا — "تمہارے بھائی کا اُس کے ساتھ کیسا سلوک رہتا تھا؟"

"میری بھابی لڑنے جھگڑنے والی عورت نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میرا بھائی اس کے ساتھ زیادہ بولتا چالتا نہیں تھا"

"رات دیر سے گھر آتا تھا؟"

"اکثر دیر سے آتا تھا"

"اس سکھ کے گھر چلا جاتا ہو گا؟" — میں نے کہا — "تمہیں بھی کچھ شک ہوا ہو گا" — وہ گھبرا رہا تھا۔ خاموش رہا۔ میں نے اسے بڑے نرم لہجے میں کہا — "تمہارا بھائی قتل ہو گیا ہے۔ مجھے قاتل کو پکڑ کر سزائے موت دلانی ہے۔ کیا تم پسند نہیں کرو گے کہ تمہارے بھائی کے قاتل کو سزا ملے؟ .... مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ میری مدد کرو۔ تم سکھ کی اُس بیٹی کے متعلق کیا جانتے ہو جو اپنے خاوند کے پاس نہیں رہتی؟"

"وہ بہت خوبصورت ہے" — اُس نے جواب دیا۔

"تمہاری بھابی سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میری بھابی بدصورت تو نہیں۔ فرق یہ ہے کہ میری بھابی سادہ طبیعت کی ہے اور بولتی کم ہے۔ سکھ کی بیٹی بہت شوخ اور ہنس مکھ ہے۔"

اس لڑکے کو میں نے اپنے ساتھ بے تکلف کر لیا۔ اُس وقت

اُسے ہمدردی کی ضرورت تھی جو میں نے دی۔ اُس کی جھجک دُور ہو گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کی بھابی بنی ٹھنی نہیں رہتی کہ اس کا بھائی خوش رہتا؟ اس نے وہی جواب دیا کہ اُس میں سادگی زیادہ ہے۔ اس نے میک اپ کبھی نہیں کیا۔ سکھ کی بیٹی کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ تو ہر وقت میک اپ کئے رکھتی ہے۔

اُس رات تفتیش یہیں پر ختم کر دی۔ رات تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ میرا شک سکھ پر پختہ ہونے لگا۔ یہ تو پہلے ہی میرے ذہن میں آ گئی تھی کہ اگر وہ قتل ہوا ہے تو کسی سکھ یا مسلمان سے دشمنی مول لے بیٹھا ہو گا۔ میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ یہ کسی رہزن یا پیشہ ور چور کا بھی کام نہیں تھا کیونکہ اُس کی کلائی میں گھڑی، انگلی میں قیمتی انگوٹھی اور جیب میں خاصی رقم موجود تھی۔ میرے پاس ایک ہی سراغ تھا کہ قاتل کے ہاتھ، بازو یا چہرے پر خراش کا گہرا نشان ہو گا۔ مقتول کے ناخنوں نے اُس کا خون نکال لیا تھا۔ یہ بھی یقین ہو چکا تھا کہ قتل کا باعث عورت ہے۔

عطر اور بال والی کوئی اور تھی

صبح پوسٹ مارٹم رپورٹ ملی۔ مقتول کو باریک رسی سے پھندا ڈال کر مارا گیا تھا۔ جسم پر کوئی اور زخم یا چوٹ نہیں تھی۔ پیٹ میں جو کھانا گیا تھا، اس سے ڈاکٹر نے لکھا کہ وہ کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد

مرا ہے۔ مرنے کا جو اندازاً وقت لکھا گیا وہ اُس وقت سے ڈیڑھ ایک گھنٹہ پہلے کا تھا جب لاش تک میں پہنچا تھا۔ اُس وقت تک لاش سرد ہو چکی تھی۔

میرا مخبری کا نظام بہت اچھا تھا۔ اس میں دو عورتیں بھی تھیں۔ عثمان نے ان سب کو ہدایات دے کر سرگرم کر دیا تھا۔ یہ لوگ زمین کی تہہ سے بھی خبریں نکال لاتے تھے۔ میں مقتول کے گھر چلا گیا۔ یہ اونچے درجے کا خاندان تھا۔ میں نے کسی عورت کو تھانے بلانا مناسب نہ سمجھا۔ مقتول کی بیوی کو علیحدگی میں بٹھا لیا۔ جوان عورت تھی۔ خوبصورت بھی تھی۔ اس پر مجھے یہ افسوس ہوا کہ اسے ساری عمر بیوہ رہنا تھا۔ ہندو بیوہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ مقتول کی لاش ابھی گھر میں پڑی تھی۔ میں نے مقتول کی بیوہ سے اظہارِ ہمدردی کیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ کوئی تفصیلی اور واضح جواب نہیں دیتی تھی۔ سر ہلا دیتی تھی یا دھیمی آواز میں ہاں یا نہ کہہ دیتی تھی۔ یہ اس کی عادت بھی تھی اور بیوگی کے غم کا اثر بھی۔

میں نے اُس سے بہت کچھ پوچھا۔ اہم سوال یہ تھے کہ مقتول کا اُس کے ساتھ رویّہ اور سلوک کیسا تھا۔ اُس نے کئی بار پوچھنے کے بعد کہا کہ وہ مر گیا ہے، میں کچھ نہیں کہوں گی۔ میں نے اُس سے یہ مطلب لیا کہ رویّہ اور سلوک اچھا نہیں تھا۔ میں نے وہ بال بڑی ہی غور سے دیکھا تھا جو لاش کے بٹن اور بٹنوں کی زنجیر میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے بیوہ کے بالوں کو غور سے دیکھا اور اپنے تجربے کی بنا پر یہ رائے قائم کی کہ

وہ بال اس عورت کا نہیں۔ اس کے بال بالکل سیاہ تھے اور وہ بال سیاہی مائل بھورا تھا۔ اس بال والی عورت کا رنگ گورا ہونا چاہیئے تھا۔ بیوہ کا رنگ گندمی تھا۔

مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ بیوہ گلاب کا عطر لگاتی ہے اور کیا گذشتہ رات اُس نے عطر لگایا تھا؟ میں اُسے قریب ہو کر سونگھ تو نہیں سکتا تھا۔ باتوں باتوں میں مجھے ایک بہانہ مل گیا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ میں نے ہمدردی سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہاتھ سونگھا۔ صرف تیل کی بُو تھی اور یہ کوئی اچھی قسم کا تیل نہیں تھا۔ ذرا دیر بعد میں اُس کے قریب ہو گیا اور ہمدردی کے "بے تابانہ" اظہار کے لئے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ جھینپ کر پرے ہٹ گئی۔ میری ناک اپنا کام کر چکی تھی۔ مجھے اس کے کپڑوں سے کسی قسم کے عطر کی خوشبو نہ آئی۔ اُس کے ہونٹوں کو دیکھا۔ لپ سٹک کا نام و نشان نہیں تھا۔ یہ تو مقتول کا بھائی مجھے بتا چکا تھا کہ اس عورت نے کبھی میک اپ کیا ہی نہیں۔

اس مشاہدے سے مجھے یقین ہو گیا کہ لاش کے ساتھ بال اس عورت کا نہیں کسی دوسری عورت کا ہے۔ میں نے اُس سے پُوچھا کہ اُسے ایسا شک ہے کہ اُس کے خاوند کی دلچسپی کسی اور عورت میں تھی؟ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دراصل وہ روایتی عورت تھی جو خاوند کے خلاف ہزار شکایتوں کے باوجود زبان نہیں کھولتی۔ ہندوؤں کی بیویوں میں یہ وفاداری زیادہ ہُوا کرتی تھی۔ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر اسے اپنے

خاوند کے خلاف کوئی شکایت نہ ہوتی تو وہ زور دے کر کہتی کہ اُسے خاوند کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ اُس کی خاموشی اور جواب دینے اور نہ دینے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خاوند سے خوش نہیں تھی۔ یہ مجھے اس کا باپ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اُس کی بیٹی کے ساتھ مقتول کا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔

"تمہارا خاوند شام کو کھانا کھا کر گیا تھا؟"

"نہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"جاتے وقت کہہ گیا تھا کہ کھانا واپس آ کر کھاؤں گا؟"

"نہیں"

"وہ گوشت کھاتا تھا؟"

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے میں نے اُس کی توہین کر دی ہو یا کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ ہندو گوشت نہیں کھاتے۔ آجکل شاید جدید ہندوؤں نے گوشت کھانا شروع کر دیا ہو۔ برہمن تو گوشت کی بُو سے بھی بھاگتے ہیں۔ مقتول برہمن تھا جو ہندوؤں کی سب سے اونچی ذات ہے۔ اس کی بیوہ کو معلوم نہیں تھا کہ پوسٹ مارٹم میں اس کے خاوند کے معدے میں جو غذا دیکھی گئی تھی اس میں گوشت بھی تھا۔

"تمہیں معلوم تھا کہ تمہارا خاوند شراب پیتا ہے؟"

اُس کا ردِّعمل پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ برہمن شراب نہیں پیتے۔ بیوہ نے کہا۔۔۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم برہمن ہیں۔ گوشت اور شراب

سکھوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی غذا ہے۔ مجھ سے ایسے ناپاک سوال نہ کریں۔"

ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ مقتول نے شراب بھی پی تھی۔ گوشت اور شراب سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مقتول عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اس سے میں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ اُس نے سکھ تاجر کے گھر کھانا کھایا اور شراب پی تھی۔ بیوہ چونکہ بھڑک اٹھی تھی اس لئے میں نے اس کے غصے سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔"سکھ بڑی ہی پاپی قوم ہے اُنہوں نے تمہارے خاوند جیسے پکے برہمن کو بھی گوشت اور شراب سے ناپاک کر دیا ہے۔"

"آپ کو کیسے پتہ چلا ہے کہ اُس نے گوشت کھایا اور شراب پی تھی؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے اُسے بتا دیا کہ مجھے کیسے پتہ چلا ہے اور کہا۔"تمہارے خاوند کو سکھ کی بیٹی نے خراب کیا اور سکھ کے بیٹے نے اسے قتل کیا ہے۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرو گی کہ جس نے تمہارا سہاگ اجاڑا ہے اُسے پھانسی دی جائے؟"

"سکھ کی بیٹی کو بھی پھانسی دی جائے گی؟" اُس نے پوچھا۔

"تم کچھ بتاؤ تو میں اُسے بھی پھانسی دلوا سکتا ہوں۔"

"ہاں"۔ اُس نے دانت پیس کر کہا۔"اُسے پھانسی دلواؤ۔ اُسی نے مجھ سے میرا خاوند چھینا ہے۔"

"تمہیں کس طرح یقین ہے؟"

"وہ میرے ساتھ اُس کی خوبصورتی کی اور اُس کی عادتوں کی تعریف کیا کرتا تھا"۔ اُس نے جواب دیا ۔ "میں اُس کی منتیں کیا کرتی تھی کہ وہ میرے حال پر رحم کرے مگر اُس نے کبھی رحم نہ کیا۔"

"تم نے اس لڑکی کو کبھی دیکھا ہے؟ کیسی ہے؟"

"وہ اتنی خوبصورت نہیں جتنے نازنخرے کرتی ہے"۔ اُس نے جواب دیا ۔ "میں نے اُسے کئی بار دیکھا ہے۔ بدمعاش لڑکی ہے۔ شریف ہوتی تو اپنے خاوند کے ساتھ رہتی۔ میرا خاوند مجھے پسند نہیں کرتا تھا پھر بھی میں اس کے ساتھ بندھی رہی۔"

"اُس کا خاوند اسی شہر میں رہتا ہے؟"

"دیہات میں"۔ اُس نے ایک گاؤں کا نام لے کر کہا ۔ "بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہے۔ اُن کے باغ باغیچے ہیں۔ وہ بہت دولت مند لوگ ہیں۔"

نئی بیٹی اور نیا شک

اس انکشاف سے مجھے ایک اور شک ہوا۔ وہ یہ تھا کہ اس سکھ لڑکی کے خاوند کو پتہ چل گیا ہوگا کہ مقتول کا میل جول اُس کی بیوی کے ساتھ ہے قتل اسی نے کیا یا کرایا ہوگا۔ مجھے اس خاوند کو بھی شاملِ تفتیش کرنا تھا۔

میں نے تھانے جاکر عثمان کو سکھ لڑکی کے خاوند کے گاؤں کا نام بتایا اور کہا کہ اس خاوند کو تھانے لے آتے اور وہاں کے نمبردار اور چوکیدار سے پتہ کراتے کہ یہ آدمی قتل کی رات گاؤں میں تھا یا کہیں باہر گیا تھا۔ عثمان کو معلوم تھا کہ یہ سراغ کس طرح لگایا جاتا ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ عثمان نے بتایا کہ اس گاؤں میں نمبردار اور چوکیدار کے علاوہ دو مخبر موجود ہیں۔

عثمان وردی اُتار کر روانہ ہوگیا۔

رات کو میں سکھ تاجر کے گھر چلا گیا۔ اُس کے ساتھ سنبھل کر بات کرنی تھی۔ ایک تو یہ بات ہی بڑی نازک تھی کیونکہ یہ اُس کی بیٹی کے متعلق تھی اور دوسرے وہ اونچے درجے کا آدمی تھا۔ اُس کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر مقتول کے قتل پر افسوس ہوتا رہا۔ میں بھی اس کی تعریفیں کرتا رہا۔ باتوں کو گھما پھرا کر میں نے اُس کی بیٹی کی بات ہمدردی کے رنگ میں شروع کی۔ اُس کے خاوند کو بُرا بھلا کہا — "آپ اتنے باعزت اور صاحب حیثیت ہیں، لڑکی ان جنگلیوں کو کیوں دے دی تھی؟" — میں نے یہ بھی کہا — "اگر آپ کہیں تو میں انہیں ایک دن میں سیدھا کر دوں۔"

اُس نے کوئی مجبوری بتائی اور بولا — "مجھے اپنی غلطی کا احساس بعد میں ہُوا۔ بیٹی کو میں نے بڑے پیار سے پالا تھا۔ یہ شہری زندگی کی عادی تھی۔ دیہاتی ماحول میں دل نہ لگا سکی۔ دیہات میں کوئی معمولی کسان ہو یا بڑا زمیندار، طور طریقے سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ داماد کے متعلق بعد میں پتہ چلا کہ اچھے چال چلن کا نہیں۔ لڑکی گھر آکر روتی تھی۔ پھر

بیٹھ ہی گئی۔ میں نے بھی اسے واپس بھیجنا پسند نہ کیا۔ ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔"

"سسرال کی طرف سے کوئی لینے نہیں آیا؟"

"دو بار سمجھوتے کے لئے آئے تھے۔" اُس نے جواب دیا۔ "لیکن سمجھوتہ ہو نہ سکا۔ وہ لوگ دھمکیاں دیتے تھے۔"

"کیسی دھمکیاں؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی ایک بتائیں۔"

"مثلاً ایک بار، کوئی چار مہینے گزرے میرا داماد آیا تھا۔" اُس نے جواب دیا۔ "بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ میری بیٹی نے اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ میری بیٹی کے کمرے میں چلا گیا۔ بیٹی نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ یہ الفاظ کہہ گیا ہے کہ جس کسی کو تم نے شہر میں یار بنا رکھا ہے اُسے میرے ہاتھوں سے بچا نہیں سکو گی۔ پہلے اُسے قتل کروں گا، پھر تمہیں اس طرح غائب کروں گا کہ کسی کو تمہاری بُو بھی نہیں ملے گی۔"

"کیا آپ میرے اس شک کی تائید کریں گے کہ سیٹھ راجیش کا قاتل آپ کا داماد ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور کیا آپ پسند نہیں کریں گے کہ میں اُسے سزائے موت دلا کر آپ کی بیٹی کو اس سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دوں؟"

اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور غائب ہو گئی۔ میں نے اُس کی دُکھتی رگ پکڑ لی تھی مگر اُسے غالباً یہ خیال آ گیا کہ اُس کی بیٹی بدنام ہو جائے گی۔ دھیمی سی آواز میں بولا۔ "لیکن ملک صاحب!... لیکن راجیش کا میری بیٹی کے ساتھ تو کوئی تعلق نہیں تھا۔

ہ تو میرے پاس آیا کرتا تھا۔ میرے بیٹے کے ساتھ بھی اس کی دوستی بڑی گہری تھی۔"

"میں نے آپ کی بیٹی پر تو کوئی شک نہیں کیا" ___ میں نے کہا ___ "میں تو اس گھر کو بڑا ہی عزت دار اور شریف گھرانہ سمجھتا ہوں۔ کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ سیٹھ راجیش کا آپ کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔ ویسے بھی وہ خوبصورت جوان تھا۔ آپ کسی کی زبان بند نہیں کر سکتے۔ آپ کے دشمن بھی ہیں اور کاروبار میں حسد کرنے والے بھی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگ آپ کے گھر کے متعلق بکواس کرتے رہتے ہیں۔ کسی نے آپ کے داماد تک سیٹھ راجیش کے متعلق بے بنیاد باتیں پہنچا دی ہوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آپ کے پاس آیا کرتا تھا۔ قتل کی رات بھی وہ مندر کی میٹنگ کے بعد آپ کے ہاں آیا تھا۔ اُس نے کھانا آپ ہی کے ساتھ کھایا ہوگا؟"

"جی ہاں" ___ سکھ نے جواب دیا ___ "وہ کبھی کبھی میرے ہاں کھانا کھایا کرتا تھا" ___ اُس نے مسکرا کر کہا ___ "برہمن گوشت نہیں کھاتے، شراب بھی نہیں پیتے۔ راجیش ان پابندیوں سے آزاد تھا۔ ویسے مذہب کا بڑا پکا تھا۔ وہ گوشت اور شراب کے لئے میرے ہاں کھانا کھایا کرتا تھا۔"

میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اُس کے گھر کس وقت آیا اور کس وقت گیا تھا۔ ان اوقات کے مطابق میں نے اپنے کچھ اندازے لگائے تو میرے ذہن میں جرم کا خاکہ کچھ یوں بنتا تھا کہ قاتل اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ جب

اندھیری گلی میں پہنچا تو قاتل نے اُس کے گلے میں رسّی ڈال کر پھندا تنگ کر دیا۔ یہ خیال بھی میرے دماغ میں آیا کہ دیہاتی سکھ اور مسلمان اس طریقے سے قتل نہیں کیا کرتے۔ وہ کلہاڑی یا برچھی استعمال کیا کرتے ہیں لیکن یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔ گلیاں کچی تھیں اس لیے کھُرا ملنا ناممکن تھا۔

سکھ تاجر سے رخصت ہوتے ہوتے میں نے اُسے کہا کہ میں اُس کے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ وہ ذرا گھبرایا۔ میں نے کہا— "مقتول کی دوستی آپ کے بیٹے کے ساتھ زیادہ تھی۔ میں اس سے مقتول کے متعلق کچھ پوچھوں گا۔ آپ کسی قسم کی پریشانی نہ کریں۔ مجھے آپ کی عزت کا پورا پورا خیال ہے۔"

میں اُسی وقت اس کے بیٹے کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔

دوستی کا رنگ کچھ اور نکلا

راستے میں اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ یہی باتیں میں اس کے باپ سے کہہ سُن آیا تھا۔ یہ جوان اور شادی شدہ آدمی تھا۔ اپنے مخصوص انداز سے میں نے اسے اپنے ساتھ بے تکلف کر لیا۔ اپنی بہن کے متعلق اس نے بتایا کہ زندہ دل لڑکی ہے۔ یہ اس کے باپ کی غلطی تھی کہ ذات برادری کے چکر میں آ کر دیہاتیوں کے گھر رشتہ دے دیا۔ اس سے

پتہ چلا کہ اس کی بہن نے دیہات کا ماحول بھی قبول نہ کیا اور خاوند کو بھی پسند نہ کیا۔ میں ذاتی طور پہ جانتا تھا کہ ایک زندہ دل لڑکی کے لیے خواہ وہ سکھ ہی ہو ایک سکھ کو قبول کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ سر کے لمبے بالوں اور داڑھی کو پسند کرنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے کئی روشن خیال اور زندہ مزاج سکھ لڑکیاں سکھ خاوندوں سے بھاگی ہوئی دیکھی ہیں۔ یہ لڑکی اسی قسم کی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ابھی اسے دیکھا نہیں تھا، دیکھنا تھا۔

مقتول کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ اچھی شکل و صورت کا تو تھا ہی وہ ہنس مکھ اور ملنسار بھی تھا۔ اس بھائی نے میری باتوں کے گورکھ دھندے میں آکر میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوتے یہاں تک بتا دیا کہ اس کی بہن مقتول کو بہت پسند کرتی تھی اور کبھی کبھی مقتول اس کی بہن کے کمرے میں بھی چلا جاتا تھا۔ گھر میں زیادہ آنے جانے کی وجہ سے اس کی بہن اور مقتول کے درمیان بے تکلفی بھی تھی۔

"کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ تمہارے اس دیہاتی بہنوئی کو اس بے تکلفی کا علم ہو گیا ہو؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "کسی نے اُسے بتا دیا ہو گا.... کیا آپ کو یہ شک ہے کہ میرے بہنوئی نے سیٹھ کو قتل کیا ہے؟"

"بڑا پکا شک ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "کیا تمہارا بہنوئی اتنا دلیر ہے کہ قتل کر سکے؟"

"وہ وحشی آدمی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ "وہ قتل کر سکتا ہے"۔ مجھے اس بھائی پر بھی شک تھا۔ اسے مقتول کی اپنی بہن کے ساتھ اتنی زیادہ بے تکلفی پسند نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ میں اسی شک کی بنا پر اس سے باتیں کرنے لگا۔ اُس وقت ہم تھانے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ عثمان واپس نہیں آیا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے برآمدے میں کھڑے ہو کر مجھے اشارے سے باہر بلایا اور پوچھا کہ یہ کون ہے؟ میں نے بتایا کہ سکھ تاجر کا بیٹا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ اُدھر آ کر پہلے ایک رپورٹ سُن لیں۔

کانسٹیبلوں کے کمرے کے پچھواڑے میری ایک مخبر عورت کھڑی تھی۔ وہ اندھیرے میں دوسری طرف سے آئی تھی اور اسی طرف سے اُسے جانا تھا۔ مخبروں کو چھپا کے رکھا جاتا تھا۔ اس عورت نے بتایا کہ سکھ کی بیٹی خاوند سے ناراض ہو کر گھر بیٹھی ہے۔ یہ وہی رپورٹ تھی جو میں سُن چکا تھا۔ نئی بات یہ پتہ چلی کہ لڑکی شوباز ہے۔ بال گوندھ کر نہیں بلکہ کُھلے یا ڈھیلے ڈھالے رکھتی ہے۔ اس دور میں کُھلے بال سخت ناپسند کیے جاتے تھے۔ ایسی عورت کو شریف نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مخبر عورت نے یہ بھی بتایا کہ اس لڑکی کا بھائی (جو تھانے میں بیٹھا تھا) اپنی بہن کی عادتوں اور خاوند سے ناراضگی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ دو تین بار بھائی نے بہن کو مارا پیٹا بھی تھا۔ مقتول کو یہ لڑکی بہت چاہتی تھی اور وہ اسی کی خاطر اس کے گھر جایا کرتا تھا۔

اس گھر کے کمروں کی شکل وصورت ایسی تھی کہ کوئی کسی کمرے میں چلا جاتے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ یہ تو میں بھی دیکھ آیا تھا۔ قلعے جیسی حویلی تھی۔ میں نے اندرونی شکل وصورت اچھی طرح دیکھی تھی۔ اگر میں سیٹھ تاجر کے کمرے سے نکل کر کسی اور کمرے میں چلا جاتا تو کوئی بھی نہ دیکھ سکتا۔ مخبر عورت نے بتایا کہ مقتول جس روز اس گھر میں جاتا تھا اُس روز لڑکی کے چاؤ چونچلے کچھ اور ہی ہوا کرتے تھے۔ اِردگرد کے لوگوں نے ان کے تعلقات کے متعلق چہ میگوئیاں شروع کر رکھی تھیں۔

میں پوری رپورٹ سُن کر لڑکی کے بھائی کے پاس جا بیٹھا اور پُوچھا — "کیا تمہیں سیٹھ راجیش اور اپنی بہن کا میل جول پسند تھا؟"

اُس نے ذرا اُکھڑے ہوئے لہجے میں کہا — "ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔"

"بات بہت بڑی تھی" — میں نے کہا — "اگر کوئی بات نہیں تھی تو بہن کو مار اپیٹا کیوں تھا؟"

"آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

"میں جو پُوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو" — میں نے کہا — "مجھے تمہارے گھر کی اتنی باتوں کا علم ہے جو تمہارے ماں باپ کو بھی معلوم نہیں .... اپنی بہن کو کیوں مارا تھا؟"

میرا بدلا ہوا لہجہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے

لگا۔ میں نے اپنا سوال دُہرایا تو اُس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا ـــ "میں اُسے کہتا تھا کہ اپنے خاوند کے پاس چلی جاؤ۔"

"تم مجھے اچھی طرح سمجھا چکے ہو کہ تمہیں بھی اُس کا خاوند اچھا نہیں لگتا تھا" ــ میں نے کہا ــ "تم نے یہاں تک کہا ہے کہ یہ تمہارے ماں باپ کی غلطی تھی کہ اُنہوں نے تمہاری بہن کو جنگلیوں کے گھر بیاہ دیا.... تم بہن کو کیوں خاوند کے گھر جانے کو کہتے تھے؟ بدنامی کا ڈر تھا؟ تمہاری بہن کا چلن اچھا نہیں رہا تھا؟"

اُس کی زبان بند ہوگئی۔ میں نے کہا ــ "بہن کو مارنے پیٹنے کی بجائے تم نے راجیش کو گھر آنے سے کیوں نہ منع کر دیا؟"

وہ بالکل ہی اُکھڑ گیا۔ وہ تعلیم یافتہ جوان تھا۔ بڑی اچھی باتیں کرتا تھا مگر اب جاہلوں کی طرح اِدھر اُدھر کی بیکار باتیں کرنے لگا۔ میں نے اُس پر سوالوں کے تیر چلانے شروع کر دیئے۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اُس پر قتل کا شک کر رہا ہوں۔

"آپ میرے بہنوئی پر قتل کا شک کیوں نہیں کرتے؟" ــ اُس نے کہا ــ "میں اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں .... میرا بہنوئی سمجھوتے کے لئے اور میری بہن کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آتا رہا لیکن دھمکیاں دے کر چلا گیا۔ وہ شریفوں کی طرح بات کر ہی نہیں سکتا۔ ایک بار وہ اپنے باپ کے ساتھ آیا تو سیٹھ راجیش بھی ہمارے گھر میں موجود تھا۔ میرے باپ نے اسے بھی بات چیت میں شامل کر لیا۔ راجیش نے

میری بہن کی طرفداری کی تو میرا بہنوئی غصے میں آگیا۔ جھگڑا بڑھ گیا۔ میرا بہنوئی اور اُس کا باپ اُٹھ کر چل پڑے۔ میرے بہنوئی نے راجیش کو پرے بلایا اور کچھ کہہ کر چلا گیا۔ راجیش نے ہمیں بتایا کہ میرا بہنوئی اُسے کہہ گیا ہے کہ تمہاری زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اس لڑکی کو لے کر کہیں دُور چلے جاؤ۔ یہاں رہو گے تو زندہ نہیں رہ سکو گے۔ اس سے پہلے وہ میری بہن کو یہ دھمکی دے گیا تھا کہ تم نے جسے یار بنا رکھا ہے اُسے مجھ سے بچا نہیں سکو گی۔"

"قتل کی رات تم کہاں تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"میں اپنے ایک دوست کے گھر تھا۔" اُس نے جواب دیا اور دوست کا اتا پتہ بھی بتا دیا۔

ایک اور بھید

میں اسی پر زور دیتا رہا کہ قاتل وہی ہے۔ مجھے ابھی لڑکی کے خاوند سے بات کرنی تھی لیکن میں اپنا شک پوری طرح رفع کرنا چاہتا تھا۔ میرے سوالوں سے تنگ آکر اُس نے کہا — "میں آپ کو ایک بات نہیں بتانا چاہتا تھا۔ آپ پولیس آفیسر ہیں، آپ پسند نہیں کریں گے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ راجیش کا میرے گھر میں آنا مجھے ناپسند نہیں تھا۔ میری اور اس کی دوستی کسی اور مقصد کے تحت تھی" — اُس نے

مجھ سے وعدے لینے شروع کر دیئے کہ میں اُس کی یہ بات پولیس آفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے سنوں گا۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس کی بات کا تعلق قتل سے نہ ہوا تو میں اسے راز رکھوں گا۔

اُس نے جب بات شروع کی تو مجھے شک ہونے لگا جیسے اسے معلوم ہی نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور وہ تھانے میں بیٹھا ہے۔ میں نے دراصل اُس پر سوالوں سے حملے کر کے اور اس پر قتل کا الزام عائد کر کے اُس کی عقل مار دی تھی۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بہرحال اُس نے جو بات کی وہ میں آپ کو مختصراً سنا دیتا ہوں۔

"آپ ہندوستانی ہیں" — اُس نے کہا — "آپ انگریز کے ملازم ہیں لیکن آپ کی دلی وفاداری اُس ہندوستان کے ساتھ ہو گی جو آزاد ملک تھا۔ اس پر پہلے مسلمانوں کا قبضہ رہا پھر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ آزاد دیس ہے۔ اسے آزاد کرانا آپ کا اور ہمارا فرض ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم حرکت میں آئیں اور اپنے ملک کو آزاد کرائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جاپان نے برما تک فتح حاصل کر لی ہے اور ہمارے وطن پرست فوجی افسروں نے انگریزوں کی فوج سے بھاگ کر اور جاپانیوں کے ساتھ مل کر انڈین نیشنل آرمی بنا لی ہے۔ سبھاش چندر بوس ہمارے نیتا (لیڈر) ہیں۔ سیٹھ راجیش اس خفیہ جماعت کا لیڈر تھا جو یہاں انڈین نیشنل آرمی کے لئے کام کر رہی ہے۔"

ہماری وہ نسلیں جو جنگ عظیم دوم کے بعد پیدا ہوتی ہیں انہیں معلوم نہیں ہوگا کہ انڈین نیشنل آرمی کیا تھی، اس لئے میں ذرا اس کا تعارف کرا دوں۔ جاپان نے جنگ عظیم کے دوسرے سال حملہ کرکے جاوا، سماٹرا، سنگاپور اور آج کے تمام تر انڈونیشیا پر قبضہ کرکے ایسی یلغار کی کہ برما پر بھی قابض ہوگیا۔ یہ انگریزوں کی بادشاہی کے علاقے تھے۔ آگے ہندوستان تھا۔ سبھاش چندر بوس بنگالی ہندو تھا۔ اس نے جاپانیوں سے جا ملاقات کی اور ہندوستان کے متعلق سودا بازی کرلی۔ ایک سکیم بنائی گئی جس کے تحت ان ہندوستانی افواج میں جو برما فرنٹ پر لڑ رہی تھیں پروپیگنڈہ کیا گیا کہ وہ ادھر سے بھاگ کر جاپانیوں کے مورچوں میں آجائیں اور انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہوجائیں۔ ہندوستانی فوجی جو جاپانیوں کے پاس جنگی قیدی تھے ان میں سے بھی اس آرمی میں شامل کرلئے گئے۔

برما فرنٹ سے ہندوستانی فوجی بھگوڑے ہوکر جاپانیوں کے پاس جانے لگے۔ انہیں وہاں انڈین نیشنل آرمی جسے آئی۔این۔اے کہا جاتا تھا میں شامل کیا جانے لگا۔ سبھاش چندر بوس اس کا کمانڈر انچیف تھا۔ چند ایک کیپٹن جن میں ڈھلون اور شاہنواز قابل ذکر ہیں جرنیل بن گئے۔ جاپانیوں کے ساتھ ہندو لیڈروں نے یہ سودا بازی کی تھی کہ جاپان ہندوستان پر فتح حاصل کرکے پورا ملک ہندوؤں کے حوالے کردے گا۔ آئی۔این۔اے میں مسلمان افسر، عہدیدار اور جوان بھی جا

شامل ہوتے تھے۔ انہیں کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ یہ تو ہندوؤں کی بلکہ کانگرس کی سکیم ہے جس کے تحت تمام تر ہندوستان پر ہندو راج قائم کیا جاتے گا۔ چنانچہ مسلمان ان سے الگ ہونے لگے۔

آئی۔ این۔ اے کوئی معمولی سی سکیم نہیں تھی۔ ہندوستان میں ہر کسی کی زبان پر آئی۔ این۔ اے کا نام تھا۔ انگریزوں کی نگاہ میں سبھاش چندر بوس MOST WANTED PERSON تھا۔

ہندوستان میں آئی۔ این۔ اے کے لئے زمین ہموار کرنے کے لئے زمین دوز کام ہونے لگا تھا۔ اس آرمی کا انجام یہ ہوا کہ جاپان کو شکست ہوئی تو انگریزوں نے آئی۔ این۔ اے کے خودساختہ جرنیلوں کو پکڑ لیا اور ان کے کورٹ مارشل ہوتے۔ سبھاش چندر بوس جاپان میں ایک طیارے کے کریش میں مارا گیا۔ ہندو بہت عرصہ تک کہتے رہے کہ سبھاش چندر بوس جسے وہ نیتاجی کہتے تھے، زندہ ہے اور ہندوستان کو آزاد کرانے آئے گا۔ یہ واضح ہو گیا تھا کہ آئی۔ این۔ اے ہندوستان سے مسلمانوں کو ختم کر کے پورے ملک میں ہندو راج قائم کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔

یہ سکھ جو میرے تھانے میں بیٹھا تھا اسی انڈین نیشنل آرمی کی بات کر رہا تھا۔ اس وقت برما کی جنگ زوروں پر تھی۔ یہ فرنٹ بہت ہی گرم تھا اور ہندوستان میں آئی۔ این۔ اے کے خفیہ گروہ سرگرم تھے۔ یہ سکھ اسی گروہ کا رکن تھا۔ یہ میرا مشاہدہ رہا ہے اور اب بھی ہے کہ انقلاب

لانے والے یا دیس کو آزاد کرانے والے نوجوانوں میں اکثریت اُن کی ہوتی ہے جو جذباتی ہوتے ہیں۔ عقل کی بجائے جذبات سے راہنمائی لیتے ہیں۔ یہ سکھ اسی قبیل کا جوان تھا۔ میں آئی۔ این۔ اے کی اصل حقیقت سے آگاہ تھا۔ یہ سکھ مجھے ایک راز دے رہا تھا۔ میں نے اُس کے جذبات کو سراہا اور اُس کی باتوں کا ساتھ دینے لگا۔ وہ اور زیادہ دلیر ہو گیا۔ میری حوصلہ افزائی سے وہ پُرجوش تقریر کرنے لگا۔ آپ یہ بھی پیشِ نظر رکھیں کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور ہو چکی تھی اور اس کے تحت قوم کو دیئے گئے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ مسلمان اب پاکستان سے کم کچھ بھی قبول کرنے پہ آمادہ نہیں تھے۔ ہندوؤں نے اُسی وقت نظریۂ پاکستان کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا اور سرگرم ہو گئے تھے۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے بعد اکثریت مسلمانوں کی ہے"— اُس نے کہا —"لیکن وہ بہرحال اقلیت میں ہیں اس لئے انہیں ہندوستان کے کسی بھی حصے پر حکومت کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ وہ ایک باعزت اقلیت سمجھیں جائیں گے۔ ہندوستان پر حکومت کا حق صرف ہندوؤں کو حاصل ہے۔"

"تم سکھ ہو"— میں نے پوچھا —"تمہیں کیا ملے گا؟"

"ایک سکھ ریاست"— اُس نے جواب دیا۔ "آج کا سارا پنجاب جس میں ریاستیں بھی شامل ہیں سکھ ریاست بن جائے گی۔ ہندو لیڈروں کے

ساتھ سودا طے ہو چکا ہے" میں نے اس سے مسلمانوں کے متعلق پوچھا تو اُس نے رازداری سے کہا — "مسلمانوں کو لنگا ڈال کے رکھا جاتے گا۔ ہندو یہ کوشش ابھی سے کر رہے ہیں کہ مسلمان ہندو مذہب قبول کر لیں۔ اگر نہ کریں تو یہاں غلاموں کی طرح رہیں۔ انہوں نے پاکستان بنانے کا جو ارادہ کیا ہے وہ ہم کبھی پورا نہیں ہونے دیں گے۔ اگر ملک کی تقسیم تک نوبت آ بھی گئی تو ہم مسلمانوں کی قتل و غارت کریں گے اور پاکستان کو فوجی طاقت سے ختم کریں گے۔"

"دیس کو تم جیسے جوشیلے جوان ہی آزاد کرا سکتے ہیں" — میں نے کہا — "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پولیس میں رہ کر میں تمہاری جماعت کی بہت مدد کر سکتا ہوں۔ تمہاری خفیہ سرگرمیاں کیا ہیں ؟ مجھے اپنی ضروریات بتا دو۔"

"ہم آئی۔ این۔ اے کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں" — اُس نے جواب دیا — "ہم یہاں تخریب کاری کریں گے۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور مسلمانوں کے لیڈروں کو خفیہ طریقوں سے قتل کیا جاتے گا۔ جب جاپانی فوج ہندوستان پر حملہ کرے گی تو ہم انگریزوں کی فوج کی ریل گاڑیاں اور اُن کے گولہ بارود وغیرہ کے گودام تباہ کریں گے۔ یہ اب چند دنوں کی بات ہے۔"

اُس نے میرے جال میں آ کر نہایت نازک راز بتا دیتے۔ یہاں تک بتا دیا کہ اُس نے گھر میں کیا کیا اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ میں نے اُسے تسلی دی سے

کہا کہ وہ کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرے اور اسے یقین دلایا کہ میں اُسے گاڑیاں تباہ کرنے کے لیے ڈائنامیٹ مہیا کروں گا۔

وہ جب تھانے سے نکلا تو بہت خوش تھا۔

خاوند کا ارادہ خطرناک تھا

اگلے دن دیہات سے سکھ لڑکی کا خاوند آ گیا۔ میں نے لڑکی کے بھائی کے اُس دوست کو بھی تھانے بُلا لیا جس کے متعلق اُس نے بتایا تھا کہ وہ قتل کی شام اُس کے گھر تھا۔ وہ ہندو تھا۔ اُس نے تصدیق کی کہ یہ سکھ اُس کے گھر تھا۔ میں نے سکھ کی طرح اِس ہندو کو بھی ہمراز بن کر دوست بنا لیا۔ اُسے بھی ڈائنامیٹ مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ اُس نے سکھ سے زیادہ جوشیلی باتیں کیں۔ وہ تو مسلمانوں کو بہت ہی جلد ختم کرنے کو بے قرار تھا۔ اُس نے ایک اور دوست کی نشاندہی کی۔ مقتول ان کا لیڈر تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ جاپانیوں کے باقاعدہ جاسوس نہیں ہیں۔ اسے بھی میں نے سختی سے کہا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ اُس نے میرے ساتھ یہ باتیں کی ہیں، ورنہ میں پکڑا جاؤں گا اور ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ وہ بھی سکھ کی طرح خوشی سے پھولا ہُوا تھانے سے نکلا۔

سکھ لڑکی کے خاوند سے پوچھ گچھ شروع کی۔ عثمان یہ خبر لے آیا تھا

کہ یہ سکھ قتل کی شام گاؤں سے کہیں چلا گیا تھا اور صبح واپس آیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اُس شام کہاں تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ اپنے گھر میں تھا۔ میں نے اُسے لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ وہ گاؤں سے غیر حاضر تھا۔ میں نے اُس کی بیوی کے متعلق بات کی تو اُس نے بتایا کہ اُس کے ہاں روپے پیسے کی کمی نہیں۔ بہت جائداد اور اراضی ہے جو سونا اُگلتی ہے۔ محل جیسی حویلی ہے لیکن اس لڑکی کو گاؤں کا ماحول پسند نہیں تھا۔

"ایسا تو نہیں کہ وہ شہر میں کسی اور کو پسند کرتی ہو؟"

اُس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا — "مجھ میں کیا کمی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرے؟"

میں نے اُس سے اُن دھمکیوں کا ذکر کیا جو اُس نے اپنی بیوی اور مقتول کو دی تھیں۔ اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ تو اپنی بیوی کو اپنے گھر لانے گیا تھا مگر وہ رضامند نہ ہوتی۔ میں نے بہت طویل پوچھ گچھ کر کے کہا — "تم گاؤں سے غیر حاضر تھے۔ کہاں گئے تھے؟"

"میں جہاں بھی گیا تھا اس سے آپ کا تعلق کیا ہے؟" — اُس نے رُعب سے پوچھا۔

"تعلق یہ ہے کہ تم نے راجیش کو قتل کیا ہے" — میں نے کہا — "کہو تم نے یہ واردات نہیں کی۔ قتل کے بعد کہاں رہے ہو؟ تم صبح کے وقت گاؤں گئے تھے۔ تم نے سیٹھ راجیش سے انتقام لیا ہے۔ تمہاری بیوی

کے ساتھ اُس کا دوستانہ تھا۔"

"میں آپ کو سچ بتاؤں گا"۔ اُس کے رعب اور دلیری پر پانی پڑ گیا تھا۔ وہ کچھ ڈر بھی گیا تھا۔ کہنے لگا۔ "میں نے قتل کا ارادہ ضرور کیا تھا لیکن اپنی بیوی کے قتل کا۔ میری بے عزتی کا باعث تو یہ عورت بنی تھی۔ میں اُسے اغوا کر کے اور اُسے خوب خوار کر کے قتل کر دینے اور لاش غائب کر دینے کا ارادہ کئے ہوتے تھا۔ سیٹھ کو قتل کرنے سے مجھے کیا حاصل ہوتا ہے؟"

"جب تک یہ ثابت نہیں کرو گے کہ تم اُس رات شہر میں نہیں آتے تھے میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

"یہ میں آپ کو بتانے سے ڈرتا ہوں"۔ اُس نے کہا۔ "میں شہر میں نہیں آیا تھا"۔ کچھ جھجک کر اُس نے شہر کے قریب کے ایک گاؤں کا نام لے کر کہا۔ "کبھی کبھی وہاں جوئے کی بازی لگتی ہے۔ ہزاروں روپیہ اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے"۔ اُس نے جواریوں کے نام بھی بتا دیتے اور کہا۔ "میں نے رات وہاں گزاری تھی۔"

میں نے سکھ کو الگ بٹھایا اور اُن جواریوں کو بُلانے بلانے کا انتظام کیا جن کے نام اس سکھ نے بتاتے تھے۔ اس کی بیوی سے ملنا ضروری تھا۔ میں وردی اُتار کر سکھ تاجر کے گھر چلا گیا۔ وردی اُتار کر جانے کا مطلب یہ تھا کہ میں لڑکی کے ساتھ تھانیداری کے رعب میں نہیں بے تکلفی سے بات کرنا چاہتا تھا۔

لڑکی جاسوس تھی

لڑکی کا باپ اپنے کام پر چلا گیا تھا۔ اُس کا بھائی گھر مل گیا۔ تپاک سے ملا۔ میں نے اُس سے زیادہ تپاک کا مظاہرہ کیا۔ اُس کے ساتھ دیس کی آزادی کی باتیں کر کے کہا کہ میں اُس کی بہن سے علیحدگی میں ملنا چاہتا ہوں۔ اُس نے مجھے اُس کے کمرے میں داخل کر دیا۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ اُس کے بال بھُورے اور کھُلے ہُوئے تھے۔ میں نے ایک نظر میں ہی پہچان لیا کہ مقتول کی قمیض کے بٹن کے ساتھ اسی لڑکی کا بال تھا۔ وہ اُداس تھی۔ آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ روتی رہی ہے لیکن اُس نے اپنے ہونٹوں کو لپ سٹک سے محروم نہیں رہنے دیا تھا۔ گلاب کے عطر کا معمہ کمرے میں داخل ہوتے ہی حل ہو گیا۔ کمرہ گلاب کی تیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردانہ باتیں کیں کہ اُن کے خاندان کو میں باعزت سمجھتا ہوں۔ مجھے قاتل کو پکڑنا ہے اور اُسے پھانسی کے تختے پر کھڑا کرنا ہے۔ میں نے اُسے صاف الفاظ میں یقین دلایا کہ اُس کے خلاف مجھے کسی قسم کا شک نہیں۔ مقتول کی میں نے بے حد تعریف کی جس سے لڑکی کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"تم پر یہ ظلم کس نے کیا ہے کہ اس وحشی سکھ کے ساتھ بیاہ دیا ہے؟" میں نے کہا ― "میں اُسے دیکھ چکا ہوں۔ وہ میرے تھانے میں

بیٹھا ہے۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اسے تمہارا نوکر رکھا جاتے۔"
"راجیش کو اُسی نے قتل کیا ہے"۔ اُس نے کہا۔ "اسے پھانسی
چڑھاتیں تو میرے دل کو سکون ملے گا۔"
میں نے چونکہ اُس کے حُسن کی تعریف کر دی تھی اس لئے اُس نے
بالوں کو جھٹکے اور گردن کو خم دے دے کر مجھ پر اپنے حُسن کا جادو
چلانا شروع کر دیا۔ وہ واقعی شوباز لڑکی تھی۔ میں نے اس جادو کے اثر
کو وقتی طور پر قبول کرتے ہوتے اُس کے جذبات کو اپنے قبضے
میں لے لیا۔
"راجیش کے ساتھ تمہاری ملاقاتیں کہاں ہوتی تھیں؟"
"اسی کمرے میں"۔ اس نے جواب دیا۔ "کبھی باہر بھی ملاقات
ہو جاتی تھی۔"
"قتل کی رات بھی وہ تم سے ملا تھا؟"
"پہلے میرے باپ کے پاس بیٹھا رہا"۔ اُس نے جواب دیا۔
۔"وہاں سے اُٹھا تو میرے کمرے میں آ گیا۔"
"تمہارے بھائی یا باپ نے دیکھا تھا؟"
"نہیں"۔ وہ شرما گئی اور بولی۔ "کسی نے نہیں دیکھا۔ ہمارا گھر
ایسا ہے کہ کوئی دیکھ نہیں سکتا۔"
"یعنی وہ تم سے چوری چھپے ملا کرتا تھا۔"
"زیادہ تر ملاقاتیں ایسی ہی ہوتی تھیں"۔ اُس نے کہا اور ایک

دروازے کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔" وہ اس راستے سے جایا کرتا تھا۔ یہ پچھواڑے کو جاتا ہے۔"

"تمہارا بھائی گھر تھا؟"

"میں نے دیکھا نہیں۔"

"راجیش جب یہاں سے نکلا تو تم نے باہر دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا ۔۔۔ "اُسے جاتے ہوئے دیکھا ہوگا؟"

"دیکھا تھا" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"گلی میں دُور یا قریب نہیں کوئی اور آدمی کھڑا یا اُس کے پیچھے جاتا نظر آیا تھا؟"

اُس نے ذہن پر زور دے کر کہا ۔۔۔ "گلی کے موڑ تک میں اُسے دروازے میں کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ موڑ مُڑا تو ایک آدھ منٹ بعد دو آدمی اُدھر جاتے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں گلی کی بتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد آگیا ہے۔ وہ دو آدمی تھے۔"

"وہ سکھ تھے؟"

"نہیں" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "ہندو یا مسلمان تھے۔"

"تمہیں بھائی نے مارا پیٹا کیوں تھا؟" میں نے پوچھا ۔۔۔ "کیا اُسے تمہارے اور راجیش کے تعلقات پسند نہیں تھے؟"

"نہیں" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "راجیش کو وہ بہت ہی پسند کرتا تھا۔ اُس نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ مجھے مارا اس لئے تھا کہ میں باپو کے

ساتھ غصّے میں آ کر بہت ہی گستاخی سے بولی تھی"۔

"راجیش اور تمہارا بھائی جس خفیہ جماعت میں تھے اس کے متعلق تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

"آپ کو اس کے متعلق کیا معلوم ہے؟"۔ اس نے پوچھا۔

"میں اس جماعت کا خفیہ ممبر ہوں"— میں نے یہ تیر ہوا میں چلایا تھا۔ مجھے یقین سا تھا کہ اسے راجیش نے اپنی خفیہ سرگرمیوں سے آگاہ کیا ہوگا۔

وہ حیران سی ہوتی اور مسکراتی بھی۔ کہنے لگی — "پھر تو آپ اپنے آدمی ہیں"— میں نے اُسے بتایا کہ میں اس جماعت کو ڈائنامیٹ اور اسلحہ دے رہا ہوں۔ میرا تیر نشانے پر لگا۔ اُس نے کہا— "راجیش مجھے جاسوسی کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ وہ مجھے ایک جگہ لے جایا کرتا تھا۔ وہاں ایک آدمی (ہندو) مجھے بڑے افسروں سے راز حاصل کرنے کے طریقے بتایا کرتا تھا۔"

اُس نے وہ جگہ بھی بتا دی اور کچھ قیمتی راز بھی دے دیئے۔ یہودیوں کی طرح ہندو بھی جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے اپنی حسین لڑکیاں استعمال کرتے رہے ہیں اور اب پہلے سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان ان لڑکیوں سے محفوظ نہیں۔ اس لڑکی نے مجھے راز حاصل کرنے اور نظریاتی تخریب کاری کے چند ایک طریقے بتلائے تھے جو اُسے سکھائے جا رہے تھے۔ یہ بالکل وہی طریقے تھے جو آپ نے

سلطان صلاح الدین ایوبی کی کہانیوں ــ "داستان ایمان فروشوں کی" ــ میں صلیبی لڑکیوں کے متعلق پڑھے ہوں گے۔

میں اسے یہ یقین دلا کر کہ میں اس کی جماعت کا ممبر ہوں اور یہ تاکید کر کے کہ اپنے کسی بھی آدمی سے میرا ذکر نہ کرے وہاں سے تھانے چلا گیا۔

ایک خط ایک جذبہ

تھانے جا کر عثمان کو بتایا کہ میں نے کیا راز حاصل کیا ہے۔ اُس نے اور میں نے سی۔ آئی۔ ڈی کے WAR STAFF کے لئے ایک رپورٹ تیار کی۔ "وار سٹاف" سی۔ آئی۔ ڈی کا شعبہ تھا جو جنگ کے دوران جاسوسوں کو پکڑنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس کا رابطہ ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ تھا۔ مقتول سکھ تاجر، اس کے بیٹے اور بیٹی اور ان کی خفیہ پارٹی کی سرگرمیاں صرف انگریزوں کے خلاف ہوتیں تو میں ان کے خلاف رپورٹ نہ کرتا، وہ تو مسلمانوں کے خلاف اور نظریۂ پاکستان کے خلاف بھی بڑی خطرناک کارروائیاں کر رہے تھے۔ میں نے یہ رپورٹ اپنے ضلعے کے ہیڈ کوارٹر کو اسی روز دستی بھیج دی۔ وہاں سے اسے "وار سٹاف" کو جانا تھا۔

لڑکی کے خاوند کو تھانے میں بٹھائے رکھا۔ میرا اصل مسئلہ تو ابھی

زوں کا تُوں پڑا تھا۔ کم و بیش بیس روز گزر چکے تھے۔ قاتل کا سراغ نہیں
ں رہا تھا۔ مقتول ہندوؤں اور سکھوں کا لیڈر تھا۔ سرکردہ ہندوؤں نے
یرے پاس آنا شروع کر دیا۔ وہ مجھ سے پُوچھتے تھے کہ کوئی سراغ
یا یا نہیں۔ خطرہ یہ تھا کہ ہندو میرے خلاف کوتاہی یا رشوت خوری کی
رپورٹ کر سکتے تھے۔ وہ واردات بہت مشہور ہو گئی تھی۔ ہندی کے
خباروں نے اسے اہمیت دے کر شائع کیا تھا۔

وہ جواری آ گئے جن کے ساتھ لڑکی کے خاوند نے، اپنے بیان
کے مطابق، جُوا کھیلا تھا۔ میں نے اُن سے الگ الگ اچھی طرح پوچھ
پچھ کی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ سکھ اُس شام اُن کے پاس چلا گیا تھا
ور وہ ساری رات جوا کھیلتے رہے تھے۔ سکھ مجھ سے اس لئے چھپا
رہا تھا کہ جوا بازی جرم تھا۔ وہ جُوئے کے اڈے کی نشاندہی کرنے سے
مبرار ہا تھا۔ میں نے اُس پر قتل کا الزام عائد کیا تو اُس نے اصل بات
تا دی۔ جُوئے کا یہ اڈہ میرے لئے نیا تھا۔ یہ جواری بھی نئے تھے۔ یہ پیشہ ور
جرم یا بدمعاش نہیں تھے۔ یہ سب روپے پیسے والے زمیندار تھے۔ اڈہ
چلانے والے البتہ پیشہ ور تھے۔ سکھ کو تفتیش سے خارج کر کے میرے
دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ میرے ہاتھ میں اب کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

یہ قتل بلاشک و شبہ انتقامی قتل تھا۔ اگر یہ رہزنی کی واردات
ہوتی تو مقتول کی گھڑی، انگوٹھی اور جیب سے نقدی غائب ہوتی۔ رہزنوں
و قتل کی ضرورت صرف اس لئے پیش آتی کہ مقتول نے مزاحمت کی ہوتی

مگر اس کے کپڑوں اور جسم پر مزاحمت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کے علاوہ رہزن خنجر یا چاقو استعمال کیا کرتے تھے۔ قتل کا باعث بہرحال لڑکی تھی۔ لڑکی کی ملاقات کے فوراً بعد اس کا قتل ہو جانا بتاتا تھا کہ قاتل لڑکی کا بھائی، باپ یا خاوند ہے یا کوئی ایسا آدمی جو مقتول کا رقیب تھا۔ مقتول کی قمیض کے ساتھ لڑکی کا ایک بال اور لپ سٹک ایک کہانی بیان کر رہی تھی۔ مجھے بھائی، باپ اور خاوند کو ہی مشتبہ رکھنا تھا۔

میں عثمان کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کر رہا تھا۔ عثمان اپنی عادت کے مطابق مجھے کہہ رہا تھا کہ میں اُسے اس لڑکی سے پوچھ گچھ کی اجازت دے دوں۔ میں اُسے اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دوسرا مشورہ یہ دے رہا تھا کہ تمام مشتبہ آدمیوں کو تھانے بلا کر دوسرا طریقہ اختیار کروں۔ میں تشدّد کا قائل نہیں تھا۔ اس دوران لڑکی کا بھائی میرے پاس آتا رہا اور وہ مجھے اپنی خفیہ جماعت کا ممبر سمجھتا رہا۔

ڈاک آ گئی۔ چند ایک خطوط تھے جو عثمان نے ہی کھولے۔ ایک خط پڑھ کر اُس نے میرے آگے رکھا اور کہا۔ "اس پر آپ یقین کریں گے" میں نے خط پڑھا۔ اُردو میں لکھا تھا۔ نیچے کوئی نام نہیں تھا۔ اُوپر کوئی مقام نہیں تھا۔ لفافے کے ٹکٹ پر جو مہر تھی وہ اتفاق سے صاف نہیں تھی۔ خط کے سارے الفاظ آج مجھے یاد نہیں رہے۔ جو کچھ لکھا تھا وہ یاد ہے۔ لکھا تھا:

"جناب عالی! السلام علیکم۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ اسی لیے ہم آپ کو یہ خط لکھ رہے ہیں تاکہ آپ تفتیش کی پریشانی سے محفوظ رہیں۔ سیٹھ راجیش کو ہم نے قتل کیا ہے۔ یہاں کے ہندو اور سکھ نوجوان لڑکوں نے ایک خفیہ پارٹی بنا رکھی ہے جو کانگریس کی ہائی کمان اور انڈین نیشنل آرمی کے نمائندوں کے احکامات پر عمل کرتی ہے۔ یہ لوگ ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت قائم کرنے کے لیے بڑے خطرناک منصوبے بنا رہے ہیں۔ ایک منصوبہ یہ ہے کہ جاپان کی فوج آجائے گی تو مسلمانوں کا قتلِ عام کیا جائے گا، اور اس سے وہی مسلمان بچ سکے گا جو ہندو مذہب میں آجائے گا.....

"راجیش اس پارٹی کا لیڈر تھا۔ ہمیں ہندو لڑکوں نے دھمکیاں دینی شروع کر دی تھیں۔ اس کے جواب میں ہم نے بھی ایک خفیہ پارٹی بنالی ہے۔ ہمارے منصوبے بھی ہندوؤں کی طرح خطرناک ہیں۔ مسلم لیگ نے پاکستان کو اپنا مقصد بنایا ہے جس میں چند ایک صوبے شامل کیے گئے ہیں لیکن ہم سارے ہندوستان کو پاکستان بنائیں گے۔ ہندوستان میں ہندو حکومت نہیں بننے دیں گے۔ ہم نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا ہے۔ بسم اللہ سیٹھ راجیش سے کی ہے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی بھی باری آجائے گی۔ ہم اپنے گروہ کو سارے ملک میں پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف جلد ہی محاذ قائم ہو جائے۔ ہندوستان اسلامی ملک بنے گا۔"

اس خط میں انہوں نے سیٹھ راجیش کے قتل کا یہ طریقہ لکھا کہ ا
مسلمان گروہ کے دو نوجوان مقتول کا پیچھا کر رہے تھے۔ انہوں نے
کہ وہ اکثر سکھ تاجر کے گھر جاتا ہے۔ مندر کی میٹنگ کے بعد اس گروہ
کسی ممبر نے اُسے سکھ تاجر کے گھر کو جاتے دیکھ لیا اور جو نوجوان قتل
لئے مقرر ہوتے تھے انہیں اطلاع دی۔ وہ گلی میں اس کا انتظار کر
رہے۔ ان کے پاس گز بھر لمبی رسی تھی۔ مقتول سکھ لڑکی کے کمرے
نکلا تو دونوں قاتل جو گلی کی نکڑ پر کھڑے تھے، اس کے پیچھے چل پڑے
وہ اندھیری گلی میں پہنچا تو ایک نے اُسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ دوسر
نے تیزی سے اس کی گردن کے گرد رسی ڈالی اور رسی کو مروڑ کر پھند
تنگ کیا پھر جھٹکے دیئے۔ وہ مر گیا تو دونوں چلے گئے۔

یہ خط بوگس ہو سکتا تھا۔ اصل قاتل نے مجھے گمراہ کرنے کے ل
یہ طریقہ اختیار کیا ہوگا لیکن میرے پاس تصدیق پہلے آچکی تھی۔ میں
سکھ لڑکی سے پوچھا تھا کہ جب راجیش اس کے کمرے سے نکلا تو اس
نے اُسے گلی میں جاتے دیکھا تھا؟ اور کیا اُس نے کسی اور کو بھی
گلی میں دیکھا تھا؟ لڑکی نے بتایا تھا کہ جب راجیش گلی کا موڑ مڑا تو اس
نے دو آدمی اُس کے پیچھے جاتے دیکھے تھے۔ وہ سکھ نہیں مسلمان
ہندو تھے۔ وہ یہی دو نوجوان ہو سکتے تھے۔

میں ابھی سکھ لڑکی کے بیان پر یقین کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ بہرحال مجھے
یہ دیکھنا تھا کہ یہ خط واقعی مسلمان لڑکی نے لکھا ہے۔

قاتل آ گئے

میں نے پہلے بھی رائے دی ہے کہ نوجوان جذباتی ہوتے ہیں، عقل کی بجائے جذبات سے کام لیتے ہیں۔ یہ خط دیکھ کر مجھے جہاں بے حد خوشی ہوئی وہاں افسوس بھی ہوا۔ خوشی اس کی تھی کہ ہندوستان میں مسلمان نوجوان بیدار تھے اور اپنے ورثے کو پہچانتے تھے۔ افسوس اس پر ہوا کہ ان کا کوئی لیڈر نہیں تھا جو انہیں خفیہ سرگرمیوں کی ٹریننگ دیتا اور ان کے جذبے کو عقل سے استعمال کرتا۔ اگر مسلمان ہندوؤں کی طرح زمین دوز تنظیم چلاتے تو ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ ان دونوں نوجوانوں کو مجھے خط نہیں لکھنا چاہیئے تھا۔ انہوں نے اپنا کام کر لیا تھا۔ خاموش رہتے۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے مجھے خط لکھا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اسے تفتیش میں شامل کر کے ان کی تلاش شروع کر دیتا۔

میں نے عثمان سے مشورہ کر کے خط اپنی جیب میں ڈال لیا۔ یہ ہمارا فیصلہ تھا کہ اسے تفتیش کے ریکارڈ میں نہیں رکھا جائے گا لیکن خط لکھنے والوں سے ملنا ضروری سمجھا۔ ایک تو میں یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ سیٹھ راجیش کے قاتل وہی ہیں اور دوسرا ارادہ یہ تھا کہ انہیں یہ نصیحت کرنی تھی کہ جذباتیت سے بچیں۔ میرے لئے قتل کا یہ کیس پیچیدہ بنتا جا

رہا تھا۔ مجھے اب "وارسٹاف" کا انتظار تھا۔ میں یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ سی۔ آئی۔ ڈی اور ملٹری پولیس آئے گی اور جہاں جہاں میں نے نشاندہی کی ہے وہاں چھاپے مارے گی۔ اسلحہ برآمد ہوگا۔ کچھ ہندو سکھ پکڑے جائیں گے۔ اس سے لوگوں کی توجہ اُدھر ہو جائے گی اور میں قتل کا کیس کسی طرح گول کر سکوں گا۔

میں نے اُسی روز سکھ لڑکی کے بھائی اور اس کے دو ہندو دوستوں کو بلایا۔ اُن کے ساتھ خفیہ کاموں کی باتیں کیں۔ انہیں کچھ نصیحتیں کیں اور بتایا کہ میں انہیں جلدی ہی کچھ اسلحہ اور ڈائنامیٹ دے رہا ہوں۔ ان سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے یہاں کے بعض مسلمان لڑکوں کو دھمکیاں دی تھیں۔ وہ کون تھے؟ انہوں نے مجھے تین لڑکوں کے نام پتے بتائے جو اس قصبے کے رہنے والے تھے۔ میں نے انہیں نصیحت کی کہ وہ کسی کو دھمکی نہ دیں کیونکہ اس طرح پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔

"وہ اپنے آپ کو مغلیہ خاندان کا جانشین سمجھتے ہیں" — ایک ہندو نوجوان نے کہا — "وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان مسلمانوں کی جاگیر ہے"۔

میں نے ان پر یہ ظاہر کیا کہ میں نے انہیں تھانیدار کی حیثیت سے نہیں ان کی جماعت کے ممبر کی حیثیت سے بلایا ہے۔ یہ نادان لڑکے میرے جال میں آگئے تھے۔ میری اُستادی کے سامنے ان کی وقعت ہی کیا تھی .... انہیں رخصت کر کے میں نے عثمان سے کہا

کہ ان تین مسلمان لڑکوں کو اس طرح تھانے سے لے آئے کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور انہیں شک بھی نہ ہو۔ میں نے یہ بھی کہا کہ انہیں تھانے کی بجائے دوسرے راستے سے میرے گھر لے آئے۔

عثمان ذہین اے۔ایس۔آئی تھا۔ رات کو تینوں کو لے آیا۔ میں انہیں گھر پر ملا۔ انہیں تسلی دی کہ وہ ڈریں نہیں۔ تینوں میرے سامنے چارپائی پر بیٹھے تھے۔ اُن کے ہاتھ مجھے نظر آ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ کی اُلٹی طرف دو لمبی خراشیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ زخم ٹھیک ہو چکے تھے۔ نشان باقی تھے۔ میں نے جیب سے خط نکال کر اسے دکھایا اور کہا۔۔۔"یہ خط تم نے لکھا ہے یا تمہارے ساتھی نے جو راجیش کے قتل میں تمہارے ساتھ تھا؟"

اُس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اس کے ہاتھ پر خراشیں مقتول کے ناخنوں کی تھیں۔ میں نے اُسے حوصلہ دیا اور کہا۔۔۔"ڈرو مت۔ صاف بتا دو۔ اگر میں تمہیں گرفتار کرنا چاہتا تو اپنے گھر نہ بلاتا۔ بولو، ورنہ میں تمہارے بچاؤ کے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"یہ خط میں نے لکھا ہے"۔۔۔اُس کا ایک ساتھی بول پڑا۔

"قتل کس نے کیا تھا؟"

"میں نے"۔۔۔اسی نوجوان نے کہا۔

"اور تم نے اسے پیچھے سے دبوچا تھا؟"۔۔۔میں نے خراشوں والے

سے پوچھا۔

اُس نے خوفزدگی کے عالم میں سر ہلا کر آہستہ سے کہا۔ "ہاں"۔

"اُس نے تمہارے ہاتھ پر ناخن مارے تھے؟" میں نے پوچھا اور اسے تسلّی دینے کے لئے کہا — "میں کہہ رہا ہوں ڈرو مت"۔

"جی ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "میں نے اُسے پیچھے سے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ شاید آزاد رہ گیا تھا۔ اُس نے ناخنوں سے چھیل دیا"۔

میں نے عثمان سے ماچس لے کر خط اُن کے سامنے جلا ڈالا اور انہیں لمبا چوڑا لیکچر دیا جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ کسی بڑی عمر کے آدمی کو اپنا لیڈر بنائیں اور محض جذبات میں آکر کوئی کارروائی نہ کریں، اور اگر قتل جیسا سنگین جرم کر بیٹھیں تو اسے ہضم کرنے کی کوشش کریں۔ زبان سے ہندوؤں پر دھاک بٹھانے کی حماقت نہ کریں، بلکہ ان کے آگے جھکے رہیں۔ شو بازی سے گریز کریں۔ میں نے ایسی بہت سی باتیں کہہ سُن کر انہیں رخصت کیا۔ مجھے روحانی سکون محسوس ہُوا۔ میں بہت دیر تک عثمان کے ساتھ قوم کی آزادی اور ہندوستان کے مستقبل کے متعلق باتیں کرتا رہا۔

"اس کافر کے قتل کا کیا بنے گا؟" عثمان نے پوچھا اور میری سوچوں کا رُخ بدل گیا۔

سی، آئی، ڈی کا چھاپہ — لڑکی خطرناک تھی

"وارسٹاف" کو رپورٹ بھیجے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ میں پریشان ہونے لگا تھا کہ سی آئی ڈی نے کوئی کارروائی نہ کی تو کیا ہوگا۔ رات کو اچانک وہ لوگ آگئے۔ اس پارٹی میں ایک ہندو اے۔ ایس۔ آئی تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس کا ایک انگریز لیفٹیننٹ تھا اور دیگر سٹاف بھی تھا جس کا انچارج بہار کا رہنے والا انسپکٹر حامد علی خان تھا۔ اس کے ساتھ میری اچھی راہ ورسم تھی۔ یہ پارٹی رات دس گیارہ بجے کے درمیان پہنچی اور اسی وقت چھاپے مارنے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے اپنے کانسٹیبل تیار کر لئے۔ تین جگہوں پر بیک وقت چھاپہ مارنا تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب سکھ تاجر کے گھر، مقتول کے گھر اور ایک ہندو جو سکھ کے بیٹے کا دوست تھا اس کے گھر چھاپہ مارا گیا۔ تینوں چھاپے پوری طرح کامیاب تھے۔ مجھے اب یاد نہیں رہا کہ کس کے گھر سے کیا برآمد ہوا تھا۔ مجموعی طور پر ہر گھر سے دو دو تین تین ریوالور، ان کی گولیاں، برچھیوں اور خنجروں کی بہت بڑی تعداد، دیسی ساخت کے دستی بم اور مزید بم بنانے کے لئے سامان برآمد ہوا۔ سکھ تاجر اور مقتول کے گھر سے کچھ خطوط بھی ملے تھے جو میں نے نہیں دیکھے۔ بہرحال ٹھوس ثبوت مل گئے۔

تھانے میں جنہیں گرفتار کر کے لایا گیا ان میں سکھ تاجر، اس کا بیٹا، اس کی بیٹی اور تین ہندو شامل تھے۔ مردوں کو میری حوالات میں بند کر دیا گیا۔ انگریز لیفٹیننٹ کو ڈاک بنگلے میں قیام کرنا تھا۔ سکھ لڑکی کو وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے یہ ڈر محسوس ہونے لگا کہ یہ گورا لڑکی کے چکر میں آ کر کیس برباد کر دے گا۔ دوسرے دن میرا ڈر دُور ہو گیا۔ اس نے لڑکی کو میری حراست میں دے کر کہا — "بہت خطرناک گروہ ہے۔ اگر آپ اس لڑکی کی نشاندہی نہ کرتے تو یہ بہت بڑے نقصان کا باعث بن سکتی تھی" — لڑکی کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ رات بھر جاگتی رہی ہے۔

انسپکٹر حامد علی خان میرے گھر میں ٹھہرا تھا۔ اُس نے ہندوؤں کے عزائم کے متعلق باتیں شروع کر دیں اور اس قسم کی رائے دی کہ یہ لوگ اگر انگریزوں کے خلاف کچھ کریں تو کوئی بات نہیں۔ یہ مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ میں انہیں نکلنے نہیں دوں گا.... اُس کے یہ جذبات دیکھ کر میں نے سیٹھ راجیش کے قتل کی اصل حقیقت اُسے بتا دی۔ میں نے صاف بتا دیا کہ اسے مسلمان نوجوانوں نے قومی جذبے کے تحت قتل کیا ہے۔ میں نے اسے مدد کے لئے کہا۔ اس نے پہلی بات یہ کہی کہ ملک صاحب، ان لڑکوں کو گرفتار نہ کر لینا۔ میں نے اُس سے مشورہ لیا اور بہت دیر اسی مسئلے پر بات چیت کرتے رہے۔

میں نے انسپکٹر حامد علی خان سے کہا کہ وہ ایسے شعبے میں

ہے جس کا ہر طرف رُعب اور اثر و رسوخ ہے۔ وہ کوشش کر کے قتل کا کیس سپیشل سٹاف کے حوالے کرا دے اور ایسا تاثر پیدا کرے کہ مقتول کو اس کی خفیہ جماعت کے کسی آدمی نے اختلافات کی بنا پر قتل کیا ہے۔

ڈیڑھ دو ہفتے بعد یہ معجزہ ہوا کہ قتل کا کیس ہیڈ کوارٹر کے سپیشل سٹاف نے لے لیا اور مجھے ایک سپیشل ڈیوٹی پر دلی بھیج دیا گیا۔ پیچھے عثمان رہ گیا تھا۔ دو ماہ بعد وہ بھی مجھ سے آملا۔ اور ہم دونوں ایک اور تھانے میں اکٹھے رہے جہاں عثمان مارا گیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں ہندوؤں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے بہار میں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا، ان کے گھروں کو آگ لگائی اور مستورات کو ذلیل و خوار کیا۔ بڑا ہی ظالمانہ قتلِ عام تھا۔ اُس وقت تک جنگ ختم ہو چکی تھی۔ جاپان ہتھیار ڈال کر تباہ ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کے ہندو راج کے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ مسلمان بیدار ہو کر جنگِ آزادی کا آغاز کر چکے تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے قتلِ عام کا طریقہ اختیار کیا۔ پہلے گڑھ مکتیشر میں پھر بہار میں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے میں مَیں دلی میں تھا۔ ایک انسپکٹر نے بتایا کہ انسپکٹر حامد علی خان جو بہار کا رہنے والا تھا اپنے شہر میں ہندوؤں کے حملے کی خبر سُن کر ریوالور لے کر بغیر اجازت چلا گیا۔ وہاں کی تباہی

دیکھ کر وہ پاگل ہو گیا۔ اُسے جو ہندو نظر آیا اُس نے اُسے ریوالور کا نشانہ بنایا۔ آخر ہندوؤں نے اُسے گھیر کر شہید کر دیا۔

سیٹھ راجیش کے قتل کا بھید کبھی پتہ نہیں چل سکا، نہ یہ پتہ چلا کہ جو لوگ تخریبی کارروائیوں میں پکڑے گئے تھے اُن کا کیا بنا۔

محبت کے پھندے سے لوہے کے پھندے تک

جوان آدمی خوبرو، خوشحال مسلمان زمیندار کا بیٹا، عمر ابھی تیئس سال نہیں ہوئی تھی، جنگل میں مرا پڑا تھا۔ وہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ اُس کی بارہ بور کی بندوق اُس کے پاس پڑی تھی۔ اگر محکمہ جنگلات کے دو آدمی اُسے دیکھ نہ لیتے تو پولیس تک اطلاع ہی نہ پہنچتی اور درندے پولیس کو ایک قتل کی تفتیش سے بچا لیتے۔ اگلی صبح تک لاش کی ہڈی بھی نہ ملتی۔ ہندوستان کے اس علاقے میں ہرن کی نسل کے جانور اور تھوڑی سی تعداد نیل گائے کی بھی تھی۔ شیر بھی تھے لیکن بہت ہی تھوڑی تعداد میں۔ بھیڑیئے زیادہ تھے۔ وہاں پرندوں کے شکار کے لئے لائسنس لینا پڑتا تھا۔ بڑے شکار کی ممانعت تھی۔ محکمہ جنگلات کے ہیڈ کوارٹر سے جو وہاں سے بہت دُور تھا ایک ہرن یا ایک نیل گائے مارنے کی تحریری اجازت مل جاتی تھی لیکن یہ اجازت نامہ کسی رسوخ والے کو یا کسی انگریز کو ہی ملتا تھا۔

اس جنگل کے ایک اہل کار نے تھانے میں اطلاع دی کہ وہاں ایک جوان آدمی کی لاش پڑی ہے۔ اُس وقت تک لاش کا پیٹ تین چار گدھ پھاڑ چکے تھے۔ محکمے کا ایک آدمی لاش کی حفاظت کے لئے وہاں موجود رہا۔ میں جاتے واردات پر فوراً پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ لاش خون آلود ہوگی اور اسے کسی درندے نے مارا ہوگا، یا اسے اپنے کسی شکاری ساتھی کی گولی لگ گئی ہوگی اور وہ ساتھی بھاگ گیا ہوگا، مگر لاش پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ گدھوں نے پیٹ پھاڑ کر انتڑیاں باہر نکال دی تھیں۔ وہاں بھی خون نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے مرنے کے بعد گدھ آتے تھے۔ میں نے جسم کا نظری معائنہ کیا۔ کہیں کوئی زخم یا چوٹ نہیں تھی۔ گردن پر نظر پڑی تو موت کا باعث معلوم ہو گیا جسے پولیس والے فوراً پہچان لیا کرتے ہیں۔ اسے ہاتھوں سے گلا دبا کر مارا گیا تھا۔ جمے ہوتے خون کے نشان صاف تھے۔

میرے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ وہ مجھ سے چار سال پہلے کا اس تھانے میں تھا۔ اُس نے مقتول کو فوراً پہچان لیا۔ اُس کے باپ کا نام بھی بتا دیا اور گاؤں کا بھی۔ وہ خوشحال زمیندار تھا۔ مقتول کی بندوق لاش کے قریب پڑی تھی۔ مارے ہوئے چار پانچ پرندے اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ مقتول کے کُرتے کی جیب سے ایک نوٹ دس روپے کا، ایک پانچ روپے کا اور دو تین روپے کے سکّے برآمد ہوتے۔ اُس کے گلے میں ایک تعویذ تھا جو سونے کے چوکور خول میں مڑھا ہُوا تھا اور انگلی میں

سونے کی انگوٹھی تھی۔ ان قیمتی اشیاء کی موجودگی بتاتی تھی کہ یہ واردات رہزنی کی نہیں، ورنہ یہ اشیاء لاش کے ساتھ نہ ہوتیں۔ یہ واردات کسی پیشہ ور مجرم کی ہوتی تو بندوق اور کارتوس غائب ہوتے۔

پھر ایک گھوڑی برآمد ہوئی جو جائے واردات سے سَو ڈیڑھ سَو گز دُور ایک درخت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ مقتول کا گاؤں جائے واردات سے تین میل دُور تھا۔ گھوڑی مقتول کی ہو سکتی تھی۔ وہاں اس کا کوئی مالک نہیں تھا۔ قاتل کی ہوتی تو یہاں بندھی نہ رہ جاتی۔ میں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے کانسٹیبل کو یہی گھوڑی دے کر کہا کہ کھوجی کو بلا لائے اور مقتول کے گاؤں اس کے گھر اطلاع دیتا جائے۔ میں نے اس دوران کھُرے دیکھنے کی کوشش کر دی۔ زمین کھُروں کے لئے اچھی تھی۔ لاش کے اِردگرد جنگلات کے اِن دو اہلکاروں کے کھُرے اتنے تھے کہ وہاں مقتول اور قاتل کے کھُرے ڈھونڈنا مشکل تھا۔ میں کھُرے اُٹھانے کے فن سے باقاعدہ واقف بھی نہیں تھا۔ لاش سے چھ سات قدم دُور ایک کھُرا نظر آیا جو لاش کی جگہ سے جا رہا تھا۔

یہ چونکہ عام گزرگاہ نہیں تھی اس لئے وہاں ان دونوں اہلکاروں کے سوا اور کسی کے پاؤں کے نشان نہیں تھے۔ میں نے کھُرے دیکھنے چھوڑ دیئے کیونکہ یہ کھوجی کا کام تھا اور کوئی کھُرا میرے پاؤں سے گم ہونے کا خطرہ تھا۔ میں محکمہ جنگلات کے اِن دونوں آدمیوں سے باتیں کرنے لگا۔ گو ایسا ممکن تو نہیں تھا لیکن ان پہ بھی شک کیا جا سکتا تھا۔

انہوں نے بتایا کہ یہاں ہرن وغیرہ کے شکار کی اجازت نہیں ہے۔ بعض آدمی پھندہ (پھاہی) لگا کر ہرن پکڑتے ہیں اور ان کی کھالیں اور گوشت بیچتے ہیں۔ لگے ہوئے پھندوں کی تلاش میں محکمہ جنگلات کے آدمی جنگل میں پھرتے رہتے تھے۔

اس روز یہ لاش دیکھنے سے پہلے انہوں نے ایک پھندہ پکڑا تھا جو قریب ہی ایک درخت کے ساتھ پڑا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پھندے میں کوئی جانور پھنسا تھا لیکن نکل گیا ہے۔ پھندے کے دندانوں پر خون لگا ہوا ہے۔ مجھے اس پھندے کے ساتھ اور اس میں سے نکل جانے والے جانور کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے سامنے ایک خوبرو جوان کی لاش پڑی تھی جس کی تفتیش مجھے نہ جانے کون سے چکر میں ڈالنے والی تھی۔ کھوجی کے انتظار میں مجھے وقت گزارنا تھا۔ اس لئے میں نے پھندے کو دیکھنا شروع کر دیا۔

یہ لوہے کا پھندہ تھا۔ نوکدار دندانوں والے دو حصے تھے۔ دونوں نئے چاند کی شکل کے تھے۔ دونوں کے دندانے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ انہیں کھول کر ایک ہُک کی مدد سے پھندے کے باقی حصے کے ساتھ لگا دیا جاتا تھا۔ پھندے کے ساتھ دو اڑھائی فٹ لمبی زنجیر تھی جس کے ایک سرے پر مضبوط کڑا تھا۔ یہ لکڑی کے ایک لمبے اور موٹے کیل میں ڈال کر کیل پورا زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا۔ پھندہ بھی زمین کے ساتھ مٹی اور گھاس میں چھپا ہوتا تھا۔ جانور کا پاؤں اس

پر پڑتا تو دندانے تڑاخ سے بند ہو کر جانور کا ٹخنہ جکڑ لیتے تھے۔ دندانے کھال میں اُتر جاتے اور جانور نکل نہیں سکتا تھا۔ پھندہ لگانے والا آکر جانور کو رسّی سے باندھتا اور پھندہ کھول لیتا تھا۔

میں نے اس پھندے کے دندانوں پر خون دیکھا تو میں سوچنے لگا کہ اس میں سے جانور نکل کس طرح گیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ صرف کھال پھندے میں آئی اور جانور نکل گیا لیکن کھال کا ذرا سا ٹکڑا یا بال کسی نہ کسی دندانے میں ہونے چاہئیں تھے۔ جنگلات کے یہ اہل کار خوش تھے کہ انہوں نے ایک پھندہ پکڑ لیا ہے۔ پھندہ لگانے والے کو پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ یہ دونوں اہل کار میرے ساتھ رہے۔ انہیں میرے ساتھ ہی رہنا تھا۔ دونوں گواہ تھے اور میری نظر میں یہ ابھی مشتبہ بھی تھے۔ میں ان کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا اور یہ بھانپنے کی بھی کوشش کرتا رہا کہ قتل کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ یہ ممکن تھا کہ پھندہ مقتول نے لگایا ہو اور ان دونوں نے اسے پکڑ لیا ہو اور جھگڑے نے ایسی صورت اختیار کر لی ہو کہ اُنہوں نے اُسے گلا دبا کر مار ڈالا ہو۔ ان کے کھرے اُس کھرے سے مختلف تھے جو میں نے جائے واردات سے جاتا دیکھا تھا۔

خون آلود کپڑے کے ٹکڑے

مقتول کا باپ، ماں اور بہت سے آدمی کھوجی اور کانسٹیبل

سے پہلے پہنچ گئے۔ کانسٹیبل انہیں اطلاع دے کر کھوجی کو بُلانے چلا گیا تھا۔ میں نے انہیں وہاں سے دُور رکھا جہاں میں نے کھُرے دیکھے تھے قیامت کا سماں بندھ گیا۔ مقتول کی ماں اور اُس کا باپ اس صدمے سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ کانسٹیبل کے کہنے پر وہ چارپائی لے آئے تھے۔ لاش اُٹھوا کر چارپائی پر رکھوا لی۔ ایسی دلدوز چیخیں اور دھاڑیں مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ پھر کھوجی بھی آ گیا۔ مقتول کے باپ نے لاش کی شناخت کے ساتھ گھوڑی بھی پہچان لی۔ مقتول صبح سویرے گھوڑی پر شکار کو نکلا تھا۔ اُس کے پاس پرندوں کے شکار کا لائسنس تھا میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ لاش لے جاتے اور پوسٹمارٹم کا انتظام کراتے۔ کھوجی نے میرے کہنے پر اپنا کام شروع کر دیا اور میں نے مقتول کے باپ کو الگ کر لیا۔ مجھے سب سے پہلے قتل کا باعث معلوم کرنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ خاندانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ دیہات میں ایسے قتل ہوتے ہی رہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ بڑے زمینداروں کے بیٹے کسانوں اور مزارعوں کی بہو بیٹیوں کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ کسی غیرت مند نے اس شہزادے کو غیرت کے جوش سے قتل کر دیا ہو گا۔ خاندانی عداوت اور غیرت کے جوش سے جو قتل ہوتے ہیں ان میں لُوٹا نہیں جاتا کیونکہ مقصد لوٹنا نہیں قتل کرنا یعنی انتقام لینا ہوتا ہے۔ اس واردات میں مقتول کی نقدی، سونے کی انگوٹھی، سونے کا تعویذ، بندوق اور کارتوس لاش کے ساتھ تھے۔

مقتول کے باپ نے بتایا کہ ہندو راجپوتوں کے ایک خاندان کے ساتھ دشمنی ہے۔ دس سال گزرے، کھیتوں کو پانی لگانے کی باری پر جھگڑا ہو گیا جو لڑائی تک پہنچ گیا تھا۔ ہندو راجپوت بھی طاقت اور پیسے والے زمیندار تھے۔ اس لڑائی میں اُن کا ایک آدمی مارا گیا، چند ایک زخمی ہوتے تھے اور اس مسلمان زمیندار کے تین چار آدمی صرف زخمی ہوتے تھے۔ دو آدمیوں کو عمر قید ہوئی لیکن اپیل میں وہ بری ہو گئے تھے۔ میرے پوچھنے پر مقتول کے باپ نے بتایا کہ اس کے بعد ہندو راجپوتوں نے چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہُوا۔ باپ سے میں نے اُس کے بیٹے کے چال چلن کے متعلق پوچھنا بیکار سمجھا۔ کوئی باپ اپنے بد معاش بیٹے کو بدمعاش نہیں کہتا۔ یہ معلومات مجھے دوسرے ذرائع سے حاصل کرنی تھیں۔

میں بہت دیر اُس سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ وہ ابھی سوچ کر جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ بات کرتے کرتے چُپ ہو جاتا اور اُس کی دھاڑیں نکل جاتیں۔ کھوجی میرے پاس آیا اور سر کے اشارے سے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ یہ اشارہ بتاتا تھا کہ اُس نے زمین سے کوئی بھید لے لیا ہے۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ ایک کھُرا ایک طرف سے لاش کی طرف آرہا تھا۔ یہی کھُرا دوسری طرف لاش سے ہٹ کر جا رہا تھا۔ یہ کھُرا مقتول کا نہیں تھا۔ کھوجی مقتول کی جوتی دیکھ چکا تھا۔ کھُرا کسی ایسے آدمی کا بھی ہو سکتا تھا جس نے ذرا دُور سے گزرتے لاش پڑی دیکھی۔

لاش تک آیا اور لاش دیکھ کر چلا گیا لیکن وہ جدھر سے آیا تھا اُسے اُدھر ہی چلے جانا چاہیئے تھا۔ یُوں سمجھیئے کہ وہ شمال کی طرف سے لاش تک آیا اور شمال مشرق کی طرف چلا گیا۔ اُس کی دونوں سمتوں کا زاویہ تقریباً ۴۵ ڈگری تھا۔

میں نے کھوجی سے کہا کہ یہ کوئی لاش دیکھنے آیا اور چلا گیا ہے۔ کھوجی نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا — "میرا تجربہ کچھ اور بتاتا ہے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا جو آپ کہتے ہیں۔ آگے چل کر دیکھیں۔"

وہ مجھے ایک جگہ لے گیا جہاں زمین تھوڑی سی کُھدی ہوئی تھی اور اس کے قریب ایک گہرا سوراخ تھا جیسے یہاں سے لکڑی کا کیل اکھاڑ گیا ہو۔ میں نے مٹی کو غور سے دیکھا تو خون کے دو تین قطروں کا شک ہوا۔ کھوجی مجھے وہاں سے بارہ چودہ قدم دُور ایک درخت کے نیچے لے گیا۔ یہ کھرا وہاں تک جاتا تھا۔ وہاں تین چار خون آلود کپڑے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر پتہ چلتا تھا جیسے کوئی اپنے زخم سے خون صاف کر کر کے یہ ٹکڑے پھینکتا رہا ہو۔ یہ پگڑی کے کپڑے کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ کھوجی نے جو کھرا اُٹھایا تھا اس کا اس نے یہ تجزیہ کیا کہ اُس نے یہی کھرا اُدھورا اُدھورا اور بُجھا بُجھا) لاش کے ارد گرد دیکھا ہے، پھر یہ کھرا اُس جگہ آیا جہاں زمین ذرا کُھدی ہوئی تھی۔ وہاں زیادہ تر کھرا صرف بائیں پاؤں کا ہے جیسے یہ آدمی ایک ٹانگ پر اچھلتا رہا ہو۔ اس کے ساتھ دو کھرے اور ہیں۔ وہاں یہ کھرا درخت

یعنی کپڑے کے خون آلود ٹکڑوں تک اس طرح گیا کہ بایاں پاؤں ٹھیک پڑ رہا ہے اور دائیں پاؤں کا کہیں صرف پنجہ ہے اور کہیں صرف ایڑی۔

آپ اس کھرے کا یہ تجزیہ اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں کہ میں مکمل طور پر بیان کروں اور اس فن کے فنی پہلو بھی بیان کروں لیکن یہ تجزیہ پوری کہانی سے بھی لمبا ہو جائے گا۔ میں آپ کو پہلے کئی بار بتا چکا ہوں کہ کھوجی بعض ایسے کھرے بھی دیکھ لیتے ہیں جو کسی اور بلکہ تجربہ کار تفتیشی افسر کو بھی نظر نہیں آتے۔ اس کھرے کے متعلق آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ ایک اہم اور پراسرار کھرا تھا۔ کھوجی نے اپنی مہارت اور تجربے کی روشنی میں یقین کے ساتھ رائے دی کہ یہ آدمی مقتول کے ساتھ تھا۔ یہ قاتل ہو سکتا ہے ــــ لیکن یہ خون؟

آہنی پھندہ گورکھ دھندا بن گیا

میں نے [illegible] کر اتنی زور سے کھوجی کے کندھے پر ہاتھ مار کر وہ دبلا پتلا ادھیڑ عمر آدمی کانپ گیا۔ میں نے جوش سے کہا ــــ "میں بتاتا ہوں یہ خون یہاں کیوں ہے" ــــ میں نے وہیں سے جنگل کے اہل کاروں کو آواز دی کہ پھندہ اپنے ساتھ لیتے آئیں۔ وہ دوڑے آئے۔ میں نے اُن سے پھندہ لے کر اس کے دندانے پھر دیکھے۔ ان پر خون کے جمے ہوئے نشان تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ انہوں نے

یہ پھندہ یہیں سے اکھاڑا ہے۔ یہ ایک معمّہ تھا جو میری عقل کا امتحان لے رہا تھا۔ میں نے بہت سوچا اور دماغ میں یہی آیا کہ پھندہ جب اہلکاروں نے دیکھا اُس وقت یہ بند تھا اور اس پر خون بھی تھا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ اس پر کسی جانور کا پاؤں آیا، پھندے نے بند ہو کر پاؤں جکڑ لیا لیکن اتنا نہیں کہ جانور پاؤں نکال نہ سکے، مگر اب یہ کھُرا دیکھ کر اور کھوجی کی باتیں سُن کر مجھے یقین سا ہونے لگا کہ پھندے میں جس کا پاؤں آیا تھا وہ کوئی جانور نہیں بلکہ انسان تھا۔ جانور اس میں سے پاؤں نہیں نکال سکتا تھا۔ صرف انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ بند پھندہ کس طرح کھولا جاتا ہے۔ اس انسان نے پھندہ کھولا اور پاؤں آزاد کر لیا۔

میں نے کھوجی کو جب پھندہ اور اس پر خون دکھایا اور بتایا کہ یہ پھندہ یہاں لگا ہُوا تھا تو اُس نے آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھول کر میرے منہ کی طرف دیکھا اور بہت دیر دیکھتا ہی رہا۔ اُس نے کھُرا ایک بار پھر دیکھا اور بولا ”اگر اس کا پاؤں پھندے میں آیا تھا تو یہ دایاں پاؤں ہوگا۔ لوہے کے اس پھندے نے تو اُس کی ہڈی توڑ دی ہو گی، اسی لئے اس کے دائیں پاؤں کا کھُرا بائیں سے بہت مختلف ہے۔ کہیں پنجہ لگا ہے کہیں ایڑی۔ بائیں کھُرے پر وزن زیادہ پڑ رہا ہے۔“

ایک سوال میرے ذہن میں آیا ”کیا یہ شخص قاتل تھا جو قتل کر کے اِدھر سے واپس گیا اور اس کا پاؤں پھندے میں آگیا؟“

کھوجی نے ایک بار پھر تمام کھُرے دیکھے اور پہلے سے زیادہ

یقین سے کہا کہ یہ شخص مقتول کے ساتھ تھا۔ میں نے پھندہ اور خون آلود کپڑے کے ٹکڑے قبضے میں لے لئے۔ دونوں اہلکاروں کو گواہوں کے طور پر پابند کر لیا اور ذہن میں یہ نقطہ رکھ لیا کہ یہ شخص جس کے یہ کپڑے اور یہ خون ہے یہ اگر قاتل نہیں تو مقتول کے ساتھ ضرور تھا۔

اُس زمانے میں پولیس کی ایک مشکل یہ بھی تھی کہ خون کا گروپ معلوم کرا لے کے لئے خون کا نمونہ بہت ہی دُور بھیجنا پڑتا تھا۔ اس کے لئے کتنے دن درکار تھے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ خون کا معائنہ تفتیش میں کچھ مدد دے سکتا ہے، عدالت اسے تسلیم نہیں کرتی۔ خون سے متعلقہ ماہرین صرف یہ معلوم کر کے بتاتے ہیں کہ یہ خون کسی انسان کا ہے یا کسی جانور کا۔ اگر جائے واردات کی کسی چیز پر گرے ہوئے خون کا گروپ کسی ملزم کے خون سے مل جائے تو پولیس کا شک اس ملزم کے خلاف پختہ ہو سکتا ہے، قانون اسے ملزم کے خلاف استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ بے شمار انسانوں کا خون ایک ہی گروپ کا ہوتا ہے۔ بس اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ پولیس ملزم کو پھر چھوڑتی نہیں۔ دوسری شہادتیں فراہم کر کے اُس کے خلاف جرم ثابت کر لیا جاتا ہے۔

سب کے پاؤں دیکھے

لاش جا چکی تھی۔ میں مقتول کے گاؤں میں چلا گیا۔ گاؤں سے چند

ایک کھیت پرے اُن ہندو راجپوتوں کے گھر تھے جن کے ساتھ دس سال پہلے مقتول کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہاں جاکر اُن کے دو معزز آدمیوں کو بُلا کر کہا کہ تمام مردوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لو۔ اگر کوئی کھیتوں میں یا کہیں اور ہے تو اُسے بھی بلا لو۔ کوئی ایک بھی غیر حاضر نہ ہو۔ میں نے نمبردار، چوکیدار اور سفید پوش کو بُلا لیا۔ ان کے سات آٹھ گھر تھے۔ کم و بیش پچیس آدمی تھوڑی دیر میں جمع ہو گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سب گھروں کو آ گئے تھے۔ نمبردار وغیرہ نے سب کو دیکھ کر مجھے بتایا کہ کوئی بھی غیر حاضر نہیں۔ میں نے گول دائرے میں کھڑا کر کے سب کے پاؤں دیکھے۔ کسی کا پاؤں زخمی نہیں تھا۔

اس کے بعد اُن سے پُوچھ کر اُن دس بارہ آدمیوں کو الگ کیا جو مقتول کے خاندان کے ساتھ دس سال پہلے لڑے تھے۔ میں نے ابھی پوچھا بھی نہیں تھا کہ ان میں سے وہ بوڑھا زمیندار جس نے دس سال پہلے پانی کا جھگڑا شروع کیا تھا، بول پڑا۔ اُس زمانے میں تھانیداروں سے لوگ خصوصاً دیہاتی لوگ، بہت ڈرتے تھے۔ کچھ کچھ جاتے تھے لیکن اس آدمی کے لہجے میں ڈر اور خوشامد نہیں تھی۔

"جناب عالی! آپ ذرا تشریف رکھیں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔ "پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کا شک رفع کرنے کی کوشش کروں گا"۔۔ دو آدمی دوڑ کر پلنگ اُٹھا لائے۔ میں بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا۔۔ "اگر انہوں نے (مقتول کے لواحقین نے) ہم پر قتل کا شک کیا ہے تو وہ بزدل اور

کمینے ہیں۔ ہم سُن چکے ہیں کہ اُن کا لڑکا مارا گیا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں وہ کس طرح مارا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ دس گیارہ سال گزرے ہماری اُن کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی اور ہمارا ایک آدمی ضائع ہو گیا اور اُن کے آدمی بری ہو گئے تھے، لیکن جناب عالی! ہم اتنے کمزور نہیں ہیں کہ بدلہ لینے کے لئے دس سال انتظار کرتے اور اُن کے لڑکے کو چوروں اور بزدلوں کی طرح قتل کرتے۔ اگر لینا ہوتا تو ہم مقدمے ختم ہوتے ہی بدلہ لے لیتے۔"

اُس نے پہلے میری ران پر پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا —

"وہ تو کھلی لڑائی ہوئی تھی۔ ہمارا آدمی نہ مرتا تو ہم تھانے میں بھی نہ جاتے۔ ہم نے بدلہ لینے کی سوچی ہی نہیں۔ یہ لڑکا جو آج مارا گیا ہے اور اُن کے دوسرے لڑکے کئی دفعہ ایسی ایسی جگہ ہمیں اکیلے ملے ہیں کہ اگر چھپ کر بدلہ لینا ہوتا تو ہم بہت پہلے اس طرح بدلہ لیتے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلتا کہ قاتل کون ہے۔ ہم نے وہ لڑائی دل سے نکال دی ہے۔"

اُس نے ایسی باتیں کیں اور ایسے لہجے میں کیں کہ میں نے مان لیں۔ بعد میں نمبردار نے بھی مجھے بڑی اچھی دلیلیں دیں اور مثالیں دے کر یقین دلا دیا تھا کہ ان لوگوں نے کبھی انتقام کی نہیں سوچی۔ تاہم میں نے انہیں ذہن سے خارج نہیں کیا۔ مقتول کے باپ نے ان کے خلاف پختہ شک کا اظہار کیا بھی نہیں تھا۔ اُس نے میرے اس سوال کا جواب دیا تھا کہ کس کے ساتھ خونی دشمنی ہے؟

میری مدد نمبردار، چوکیدار اور میرے مخبر ہی کر سکتے تھے۔ نمبر
نمبردار اور چوکیدار کو ساتھ لے گیا۔ تھانہ دو میل دُور تھا۔ انہیں مخبری کے
لئے ضروری ہدایات دیں اور بتایا کہ کوئی ایسا آدمی دیکھو جس کا پاؤں زخمی
ہو تو فوراً مجھے اطلاع دو۔ مخبروں کو الگ ہدایات دیں۔ لاش بارہ میل دُور پوسٹمارٹم کے
لئے گئی تھی۔ رات کے آخری پہر واپس آئی۔ مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ
دوسرے دن ملی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ موت گلا دبانے سے واقع ہوئی
ہے۔ جسم پر اور کوئی زخم اور چوٹ نہیں تھی، سوائے پیٹ کے جو
گدھوں نے پھاڑا اور انتڑیاں وغیرہ نکال کر کھا لی تھیں۔

اُس روز شام کو مقتول کے باپ کو بلایا۔ اُس کے ساتھ ہمدردی
کی، حوصلہ دیا اور اُسے کہا کہ اب وہ ہوش اور عقل ٹھکانے رکھ کر میرے
سوالوں کا جواب دے تاکہ میں اُس کے بیٹے کے قاتل کو پکڑ سکوں۔
اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُسے ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ اُس
سے پہلا سوال یہ کیا کہ اُس کے بیٹے کے پاس پھندہ تھا اور کیا اُس نے
کبھی جنگل میں پھندہ لگایا تھا؟ باپ نے بتایا کہ اُس کے پاس پھندہ نہیں
تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اگر پھندہ تھا تو وہ بتا دے، اس کی اُسے سزا
نہیں ملے گی، اس سے شاید قاتل کی تلاش آسان ہو جاتے۔ اُس نے مجھے
یقین دلا دیا کہ مقتول کے پاس پھندہ نہیں تھا۔ اُسے صرف پرندوں کے
شکار کا شوق تھا جس کے لئے اُس نے باقاعدہ لائسنس لے رکھا تھا۔

”لڑکے کے متعلق آپ کو کبھی شکایت ملی تھی کہ اُس نے کسی کی بیٹی

کو چھیڑا ہے یا کوئی ایسی حرکت کی ہو گی جس کا کسی نے انتقام لیا ہو۔"
میں نے پوچھا۔

منگنی کہیں اور دل کہیں اور...

میری توقع کے مطابق باپ نے بیٹے کی تعریفیں شروع کر دیں۔ انہی تعریفوں کے سلسلے میں اُس نے بتایا کہ لڑکا اتنا شریف تھا کہ برادری کے دو گھرانے گھر آکر اپنی بیٹیوں کے رشتے دیتے تھے۔ کوئی ایک مہینہ ہوا کہ اس کی منگنی کر دی گئی تھی۔ یہ بات سُن کر میرا دماغ کسی اور طرف چل پڑا۔ دیہات میں ایسا تو نہیں ہوتا کہ کسی لڑکی کے ماں باپ اپنی پسند کے لڑکے کے گھر جا کر لڑکی دیں۔ کسی کی زبانی کہلوایا جا سکتا ہے۔ وہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کی لڑکی کو ٹھکرا کر بیٹے کی منگنی کہیں اور کر دی جاتی ہے تو ٹھکرائی ہوئی لڑکی کے والدین اُسے اپنی ناقابلِ برداشت توہین سمجھتے ہیں۔ اس قتل میں بھی مجھے ایسا ہی شک ہوا۔ میں نے مقتول کے باپ سے تفصیلی پُوچھ گُچھ کی۔ بہت کریدا مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ دو گھرانوں کی لڑکیوں کے پیغام کسی کی معرفت آتے تھے لیکن رشتہ ایک تیسرے گھرانے کا قبول کیا گیا۔ جن دو گھرانوں کو مایوس کیا گیا تھا اُن کے متعلق باپ نے بتایا کہ اُن کی حیثیت ایسی نہیں کہ ایسے سنگین طریقے سے انتقام لیتے۔ وہ شریف لوگ

ہیں اور قریبی رشتہ داری بھی ہے۔ منگنی ایک اور گاؤں میں ہوئی تھی جو
اِس گاؤں سے دو، ڈیڑھ میل دُور تھا۔

میں اتنا سمجھ گیا کہ قتل کا باعث بہت ہی خفیہ ہے اور یہ محبت اور رقابت کا ڈرامہ ہے، اور اگر یہ انتقامی قتل ہے تو بھی اس میں کسی لڑکی کا عمل دخل ضرور ہوگا۔ مقتول کے باپ سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا سوائے اس کے کہ مقتول کی منگنی ہو چکی تھی۔ مجھے لڑکی والوں سے کچھ نہیں پُوچھنا تھا۔ اب نمبردار، چوکیدار اور مخبر ہی مجھے کچھ بتا سکتے تھے اور مجھے اپنے دماغ سے کام لینا تھا۔ ان لوگوں کو تھانے بُلایا۔ نمبر دار اور چوکیدار نے ایک ہی جیسی رپورٹ دی جو مختصراً یہ تھی کہ مقتول اچھے چلن کا آدمی نہیں تھا۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ خوشحال اور امیر زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیٹے اپنے آپ کو شہزادے اور اپنے سے کم درجے کی ذاتوں کے لوگوں کو اپنی زرخرید اور غلام رعایا سمجھتے تھے۔ غریب کسانوں اور مزارعوں کی بہو بیٹیوں کا شکار کھیلتے رہتے تھے۔

نمبر دار نے بتایا کہ ایک غریب مزدور کی جوان بیٹی کے ساتھ مقتول کا گہرا اور در پردہ میل جول تھا۔ لڑکی کے باپ نے دو مرتبہ نمبر دار سے کہا تھا کہ یہ لڑکا اُن کے اِردگرد چکر لگاتا رہتا اور اُن کی لڑکی کو خراب کرتا ہے۔ نمبر دار نے مقتول کے باپ کے ساتھ بات کی تھی لیکن باپ نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کی بجائے لڑکی کے باپ کو گالیاں دیں اور یہ کہا تھا کہ وہ اُس کے بیٹے کو بدنام کرتا ہے۔ چوکیدار نے نمبر دار کی تائید کی۔

انہوں نے بتایا کہ لڑکی کا سارا خاندان اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتا ہے۔ گاؤں سے تھوڑی ہی دُور اینٹوں کا ایک بھٹہ تھا۔ میں نے نمبردار اور چوکیدار سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور یہ بھی پوچھا کہ ان مزدوروں میں اتنی ہمت ہو سکتی ہے کہ عزت کے انتقام میں قتل کر دیں؟

"غیرت جاگ اُٹھے تو انسان امیری غریبی اور زندگی موت کی پرواہ نہیں کرتا۔" نمبردار کے یہ الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں —— "میں یہاں تک جانتا ہوں کہ لڑکی پوری طرح مقتول کے قبضے میں تھی۔ اسے ماں باپ نے مارا پیٹا بھی تھا لیکن وہ مقتول سے ملنے سے باز نہیں آتی تھی۔ اس کا یہی علاج تھا کہ لڑکی کو ختم کر دو یا لڑکے کو۔ ان مزدوروں کی بھی آخر عزت ہوتی ہے۔"

مخبروں نے بھی مقتول کے متعلق ایسی ہی رپورٹیں دیں۔ میں نے ان کے مطابق گاؤں کے تین چار آدمیوں کو ذہن میں رکھ لیا اور ان سے تفتیش کا کام اپنے اے۔ ایس۔ آئی کے سپرد کر دیا، مگر مجھے ان سے کوئی سراغ ملنے کی توقع نہیں تھی۔ میں اینٹوں کے بھٹے پر چلا گیا صرف نمبردار میرے ساتھ تھا۔ وہ لڑکی اور اس کے باپ کو پہچانتا تھا۔ ایک بہت ہی لمبے چوڑے نشیب میں بہت سے مزدور، ان کی عورتیں اور بچے سانچوں میں گیلی مٹی بھر بھر کر کچی اینٹیں ایک جگہ رکھتے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کی الگ تھلگ بستی تھی جس میں صرف جھونپڑے تھے۔ میں ان کے درمیان گھومنے پھرنے لگا۔ میں وہ چیزیں دیکھ رہا تھا۔ ایک ہر مرد

کے پاؤں اور اُن کے چہرے۔ تھانیدار کو دیکھ کر قاتل کے چہرے کا تاثر بدلنا لازمی تھا اور قاتل کا پاؤں زخمی ہونا چاہیئے تھا۔

مجھے دونوں چیزیں نظر نہ آئیں۔ نہ کسی کے چہرے کا تاثر بدلا، نہ کسی کا پاؤں زخمی تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ لوہے کے پھندے میں جو پاؤں آیا ہے، وہ معمولی زخمی نہیں ہوگا، وہ آدمی چلنے کے قابل نہیں ہوگا اور اُس کے پاؤں پر پٹی بندھی ہوگی۔ ان مزدوروں کے پاؤں ٹھیک تھے۔ نمبردار نے مجھے وہ لڑکی دکھائی۔ وہ نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی، اپنی برادری کی دوسری لڑکیوں کی نسبت صاف ستھری اور قدرے الگ تھلگ تھی۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ اس کے باپ کو الگ کر لے۔ میں اُسے ایک طرف لے گیا۔

وہ ڈر سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اُسے حوصلہ دیا اور اُس سے مقتول اور اُس کی بیٹی کے تعلقات کے متعلق پوچھا۔ اُس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور رو پڑا۔ مقتول کے ساتھ اپنی بیٹی کی ملاقاتوں کی اُس نے پوری تفصیل سنا دی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کی بیٹی کا رشتہ طے ہو چکا ہے لیکن لڑکا پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اُس کے والدین کہتے ہیں کہ لڑکی ٹھیک نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ لڑکا لڑکی کو پسند کرتا ہوگا؟ باپ نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ میں نے اُس سے یہ بھی پوچھا کہ لڑکے نے کبھی اُسے کہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو زمیندار کے اس بیٹے سے ملنے سے روکے؟ باپ نے کہا کہ نہیں، ایسی بات اُس

نے کبھی نہیں کہی تھی۔ پھر اُس سے اُس کی برادری کے آدمیوں کے متعلق پوچھا کہ کسی نے تو اسے کہا ہوگا کہ اپنی بیٹی کو باز رکھے۔ اس نے مہمل سا جواب دیا۔

اُونچی حویلیوں میں بھی ...

میں نے اس لڑکے کو بلا لیا۔ وہ تنومند جوان تھا گھبرایا ہوا تھا۔ بھٹے کے مالک کو الگ لے جا کر پوچھا کہ ان میں کوئی غیر حاضر تو نہیں؟ اُس نے سب کو دیکھ کر بتایا کہ سب کام پر موجود ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اس قبیلے کے چند ایک آدمی دوسری جگہوں پر بھی کام کرتے ہیں۔ میں نے اسے قتل کا دن بتا کر پوچھا کہ اچھی طرح یاد کر کے بتائے کہ اُس روز یہ آدمی یا ان میں سے کوئی اور کام سے غیر حاضر تھا؟ — اُس نے وثوق سے بتایا کہ سب حاضر تھے۔ میں اس لڑکے کو اپنے ساتھ تھانے لے چلا تو نمبردار نے مشورہ دیا کہ ان کے سب سے بڑے پنچ اور لڑکی کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ ان سے اندر کی باتیں معلوم ہونے کی توقع تھی۔ میں نے پنچ اور لڑکی کو ساتھ لے لیا۔ پنچ اس قبیلے کا سردار تھا۔ نمبردار نے میرے لئے گھوڑے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے نمبردار کو فارغ کر دیا اور ان تینوں کو تھانے لے گیا۔

پہلے جوان آدمی کو اندر بلایا۔ غریب آدمی بہت ڈرا ہوا تھا۔ میں

نے اُس کے پاؤں پہلے بھی دیکھے تھے۔ اب پھر دیکھے۔ اُس کے پاؤں میں جوتی نہیں تھی اور اس کا کوئی پاؤں زخمی بھی نہیں تھا۔ جاتے واردات پر کھرے جوتی کے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی جوتی کہاں ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ان کے ہاں جوتی پہننے کا رواج ہی نہیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ لوگ شادی اور تہوار پر جوتی پہنا کرتے ہیں۔ ان کی ایک بار کی خریدی ہوئی جوتی ساری عمر نئی رہتی ہے۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ قاتل نہیں۔ لڑکی کا اپنا کوئی بھائی نہیں تھا۔ باپ قتل کے قابل نہیں تھا۔ میرا دماغ اب اس لائن پر کام کر رہا تھا کہ ان کی برادری نے مقتول کو قتل کرایا ہو گا۔

اس آدمی سے میں نے پوچھا کہ وہ لڑکی کو پسند کرتا تھا اور کیا وہ اسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ لڑکی اُسے پسند ضرور تھی لیکن زمیندار کے اس بیٹے نے اسے تحفے اور پیسے دے دے کر اس کا دماغ خراب کر دیا تھا، اس لئے وہ اس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ اُس نے لڑکی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ اُس نے لڑکی کے باپ سے بھی کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کو قابو میں رکھے۔ میں بہت دیر اسے گھیرنے اور اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ بے گناہ تھا۔ اس کے دل میں مقتول کے خلاف نہیں بلکہ لڑکی کے خلاف نفرت تھی۔ اسے میں نے باہر الگ بیٹھا دیا اور اس

کے پنچ کو بلایا۔

"....اگر جھوٹ بولو گے تو یہاں سے باہر نہیں جا سکو گے"۔۔۔ میں نے اسے کہا۔۔۔"یہاں سے جیل خانے میں جاؤ گے اور ساری عمر وہیں گزارو گے۔ سچ بتا دو گے تو مزے میں رہو گے۔"

میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ تفتیشی افسر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ چہروں کی تبدیلیوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ مجرم بھی یہ دھمکی سُن کر گھبرا جاتا ہے اور بے گناہ بھی لیکن دونوں کی گھبراہٹ میں فرق ہوتا ہے۔ میں نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا۔ وہاں مجھے صرف خوف نظر آیا۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ میں نے اسے سنبھلنے کی مہلت نہ دی اور کہا۔۔۔"اُس آدمی کا نام بتا دو۔ مجھے یہ آدمی جو تمہارے ساتھ آیا ہے بہت کچھ بتا گیا ہے۔ قتل تم نے کرایا ہے یا ان لوگوں نے قتل کر کے تمہیں بتایا تھا؟"

وہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح رو پڑا اور ہاتھ جوڑ کر فریادیں کرنے لگا۔۔۔"حضور! ہم نے کل شام سُنا ہے کہ زمینداروں کا چھوکرا جنگل میں مارا گیا ہے۔ ہماری اتنی جرأت کہاں ہو سکتی ہے کہ دھن والوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھیں۔ آپ قتل کی بات کر رہے ہیں۔"

"تم نے لڑکی کے باپ سے کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو زمیندار کے بیٹے سے نہ ملنے دے۔"

"میں نے صرف ایک بار اُسے یہ بات کہی تھی"۔ اُس نے کہا۔۔۔

"لیکن لڑکی کی اپنی ماں لڑکی کے ساتھ ہے، وہ خود لڑکی کو بتاتی ہے کہ جاؤ وہ فلاں جگہ کھڑا ہے۔ وہ لالچی عورت ہے۔ ہم نے یہ حال دیکھا تو پھر کبھی لڑکی کے باپ سے کچھ نہیں کہا۔ اگر ہمیں قتل کرنا ہوتا تو لڑکی کی ماں کو قتل کرتے۔"

میں نے پھر بھی اسے ڈھیل نہ دی۔ پوچھ گچھ کے مخصوص طریقے سے تیر چلاتا رہا اور وہ روتا رہا اور رو رو کر جواب دیتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا — "حضور والا! ہم لوگوں کی نہ کوئی عزت ہے نہ ہم میں غیرت ہے۔ ہماری کون سی عورت صاف ہے۔ جہاں سے پیٹ بھر کھانا اور دو چار پیسے بغیر مشقت کے مل گئے ہماری عورتیں وہاں اپنی عزت دے آتی ہیں۔ ہم میں قتل کرنے کی ہمت ہوتی تو ہم رہزن اور ڈاکو بنتے، آٹھ آنے روز پر صبح سے شام تک اینٹیں نہ بناتے رہتے۔ آپ نے ہمیں اس لئے تھانے بلوایا ہے کہ ہم غریب ہیں۔ ہم دو نوالوں کی خاطر ہر کسی کی جوتیوں میں بیٹھ جاتے ہیں" — وہ رو رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ بولتے بولتے وہ طیش میں آ گیا۔ کہنے لگا — "ان بڑے بڑے زمینداروں کی بیٹیاں بھی ہماری لڑکی کی طرح خراب نکل آتی ہیں۔ آپ کسی اونچی حویلی میں جا کر اس طرح کسی لڑکی کو تھانے میں لا سکتے ہیں جس طرح آپ ہماری لڑکی کو لے آتے ہیں؟ ... نہیں حضور! مشتبہ اور مجرم صرف ہم ہیں کیونکہ ہمارے بدن پر کپڑا نہیں اور پیٹ میں روٹی نہیں" — وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ گھبرا کر اور ہاتھ جوڑ کر بولا — "حضور والا! مجھے بخش دینا، میں

نے بہت بدزبانی کی ہے۔"

میں نے اُسے اس لئے بخش دیا کہ مجھے وہ مجرم نظر نہ آیا۔ بہت وقت صرف کر کے اُسے کھنگالا۔ وہ مجھے صاف نظر آیا۔ اسے بھیج کر لڑکی کو بلایا۔ اُس نے مقتول کے ساتھ اپنے تعلقات پر پردہ ڈالنے کی بالکل ہی کوشش نہ کی۔ اُسے مقتول کے قتل ہو جانے کا بہت افسوس تھا۔ یہ لڑکی میری مدد کر سکتی تھی۔ میں اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس آدمی نے جس کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہوا تھا کوئی دھمکی دی تھی یا کسی اور آدمی نے اسے مقتول سے ملنے سے روکا تھا یا کوئی آدمی ان کے قبیلے میں اتنا دلیر ہے جس نے مقتول کو رقابت یا غیرت کے جوش میں قتل کیا ہو؟ میں نے اپنے انداز سے اس سے پوچھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اس کے جذبات کو بھڑکاتا بھی رہا اور اس میں انتقام کی آگ سلگانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ پہلے ہی بھڑکی ہوئی تھی۔ میں نے جلتی پر تیل ڈالا۔ مقتول کی تعریفیں اور اُس کے قتل پر افسوس کرتا رہا۔ اس لڑکی کی بھی تعریفیں کرتا رہا کہ اسے چاہنے والا اتنا خوبرو اور اتنے اُونچے خاندان کا تھا۔ میں نے لڑکی کو شرمسار نہ کیا۔

لڑکی گاڑی تلے آگئی

وہ میرے سوالوں کا جواب دیتی چلی گئی۔ اُس کے دل سے

میرا ڈر اُتر گیا تھا اور وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھ رہی تھی لیکن اس کے جوابوں سے میرا مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے جوابوں کے مطابق قاتل اس کی برادری یا قبیلے میں نہیں تھا۔ جس آدمی کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہُوا تھا وہ اتنا دلیر نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ لڑکی نے بھی مجھے مایوس کر دیا۔ مجھے اس پر شک نہ ہُوا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے، بلکہ وہ دانت پیس پیس کر کہتی تھی کہ میں قاتل کو پکڑ لُوں اور اس کے سامنے پھانسی دوں۔

میں دراصل ابھی تک قتل کا باعث معلوم نہیں کر سکا تھا۔ میں بالکل اندھیرے میں تھا اور مجھے نظر آنے لگا تھا کہ قاتل کا سراغ لگانا بہت ہی دشوار ہے۔ مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ قاتل ہی تھا جس کا پاؤں پھندے میں آیا تھا اور اُس کا پاؤں زخمی ہو گا۔ کھوجی نے بھی کھُروں کے تجزیے کے بعد یہی رائے دی تھی۔ ہم دونوں غلط ہو سکتے تھے کیونکہ یہ محض قیاس تھا، لیکن یہ تنکے کا سہارا تھا جسے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ان تینوں کو فارغ کر کے یہ کارروائی کی کہ ضلعے کے تمام تھانوں کو اس واردات کی تحریری اطلاع دی اور لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ملزم مفرور ہے۔ اس کا حلیہ تو مجھے معلوم نہیں تھا، میں نے لکھا کہ اس کا دایاں پاؤں دندانوں والے آہنی پھندے میں پھنس کر زخمی ہو گیا ہے۔ ایسا کوئی مشکوک آدمی نظر آئے جس کا دایاں پاؤں زخمی ہو، اُسے پکڑ لیا جائے۔

یہ پولیس کا ایک طریقہ ہوتا ہے کہ کوئی سراغ نہ ملے تو تھانیدار گردونواح کے تھانوں کو بلکہ دُور دُور کے تھانوں کو بھی واردات کی مختصر سی نوعیت اور ملزم کا حُلیہ لکھ کر بذریعہ ڈاک بھیج دیتا ہے۔ ہر تھانے کا عملہ ملزم کو پکڑنے میں مدد دیتا ہے۔ اس واردات میں میں نے یہ کارروائی ضروری سمجھی۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ ملزم باہر کا آدمی ہے۔ یہ کام کر کے میں مارا مارا پھرنے لگا۔ مخبروں، نمبردار اور چوکیدار کی میں نے جان کھالی۔ میں آپ کو طوالت کے ڈر سے سُنا نہیں سکتا کہ میں نے کیسے کیسے آدمیوں اور عورتوں سے تحقیقات کی اور کہاں کہاں گیا۔

واردات کو ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ مجھے ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ایک روز اطلاع ملی کہ مقتول کی منگیتر گاڑی کے نیچے آکر کٹ مری ہے۔ میرا خیال تھا اُس نے خودکشی کی ہو گی اور اس کی وجہ یہ ہو گی کہ وہ مقتول کو چاہتی ہو گی اور غم نے اُس پہ اتنا غلبہ پایا کہ اُس نے خودکشی کر لی۔ مجھے اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خودکشی چونکہ ریلوے لائن پر ریل گاڑی کے نیچے آکر کی گئی تھی اس لئے اس کی تحقیقات ریلوے پولیس کے ذمے تھی۔ یہ یاد رکھئے کہ مقتول کی منگیتر کا گاؤں مقتول کے گاؤں سے پونے دو میل دُور تھا اور ریلوے سٹیشن ان دو نوں سے دو اڑھائی میل دُور تھا۔ یہ چھوٹا سا برانچ لائن کا سٹیشن تھا۔

میں نے خودکشی کی اس واردات کی طرف دھیان نہ دیا لیکن چوکیدار جو مجھے یہ اطلاع دینے آیا تھا اُس نے یہ کہہ کر کہ لڑکی رات کے

وقت گاڑی پر سوار ہوتے گری اور گاڑی کے نیچے آگئی، مجھے چونکا دیا۔
وہاں سٹیشن پر ایک قلی تھا جس نے لڑکی کی لاش پہچان لی اور اس کے گھر والوں کو اطلاع دی۔ چوکیدار پوری خبر لایا تھا۔ اُس نے یہ باتیں قلی سے پوچھی تھیں۔ اس کی اطلاع کے مطابق لڑکی چلتی گاڑی میں سوار ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ گھر کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اُس کی جیب میں نوٹوں کی شکل میں خاصی رقم تھی لیکن ٹکٹ نہیں تھا۔ اگر یہ اطلاع صحیح تھی تو لڑکی گھر سے بھاگ رہی ہو گی۔ رات گیارہ بجے ایک معزز خاندان کی کنواری لڑکی کا گاڑی میں سوار ہونا اور اس کے ساتھ گھر کے کسی آدمی کا نہ ہونا بھی ظاہر کرتا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ رہی تھی۔ اُس کے پاس رقم بھی تھی۔ میرے دماغ میں کچھ سوال آتے۔

کیا لڑکی کسی ایسے آدمی کے ساتھ بھاگ رہی تھی جس کے ساتھ اس کی درپردہ میل ملاقات تھی؟

کیا یہ آدمی قاتل ہو سکتا ہے؟

اگر لڑکی کو کسی کے ساتھ بھاگنا ہی تھا تو مقتول کو قتل کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

کیا مقتول کو اس آدمی کے متعلق معلوم تھا کہ اس کی منگیتر کے ساتھ اس کا تعلق ہے؟

اگر ہے تو کیا یوں نہ ہوا ہو گا کہ مقتول اور اس آدمی کی لڑائی ہوئی ہو اور اسس آدمی نے موقعہ غنیمت جان کر مقتول کو جنگل میں جا قتل

کیا ہے وہ؟

لڑکی دفن ہو چکی تھی۔ میں نے چوکیدار اور مخبروں سے کہا کہ وہ معلوم کریں کہ لڑکی کے درپردہ تعلقات کس کے ساتھ تھے۔ چوکیدار نے وہیں اپنی رائے دے دی کہ لڑکی ایسی نہیں تھی۔ پردہ تو نہیں کرتی تھی لیکن باہر کم نکلتی تھی۔ گاؤں میں کسی کا راز چھپا رہ ہی نہیں سکتا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو بے نقاب ہو جاتی۔ چوکیدار نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کے گھر اسی کی عمر کا ایک نوکر ہے۔ لڑکی جب کھیتوں کی طرف کبھی کبھی گھومنے پھرنے جاتی تھی تو یہ نوکر ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے متعلق اُس نے بتایا کہ یہ عام قسم کے نوکروں اور مزارعوں جیسا نوکر نہیں تھا۔ دس بارہ سال کی عمر میں اسے کہیں سے لائے تھے۔ صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسے لگتا ہے جیسے ان کے گھر کا فرد ہو۔

یہ چونکہ میری واردات نہیں تھی، اس لئے میں نے لڑکی کے گاؤں جا کر تحقیقات کی ضرورت نہ سمجھی۔ چونکہ یہ مقتول کی منگیتر تھی اس لئے مجھے اپنے مطلب کی کچھ معلومات حاصل کرنی تھیں۔ میں ریلوے سٹیشن پر چلا گیا اور سٹیشن ماسٹر سے لڑکی کے حادثے کے متعلق پوچھا۔ اُس نے وہی بتایا جو مجھے چوکیدار بتا چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر تیل کی صرف دو بتیاں جل رہی تھیں۔ روشنی بہت کم تھی۔ لڑکی سب سے آگے والے ڈبے میں سوار ہونے لگی تھی اور گر پڑی۔ تھوڑا آگے جا کر گاڑی رک گئی۔ جب سٹیشن ماسٹر وہاں پہنچا اُس وقت دس بارہ

آدمی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ لاش روشنی میں لائی گئی تو ایک قُلی نے پہچان لی۔ لڑکی کی دونوں ٹانگیں اور ایک بازو جسم سے الگ ہو گیا تھا۔ بکنگ کلرک نے بتایا کہ اس گاڑی کے لئے اُس سے پانچ مسافروں نے ٹکٹ لئے تھے۔ ان میں یہ لڑکی نہیں تھی۔ ایک آدمی نے دو ٹکٹ انبالہ کے لیے لئے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی کے ساتھ یہی آدمی ہو گا جس نے دو ٹکٹ لیے تھے، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یہ آدمی کسی اور کا ساتھی ہو اور لڑکی بغیر ٹکٹ اکیلی جا رہی ہو۔ بکنگ کلرک کو اس آدمی کی شکل یاد نہیں تھی۔ روشنی کافی نہیں تھی اور بکنگ کلرک کو کسی کی شکل دیکھنے اور یاد رکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں اگلی رات کو گاڑی میں سوار ہوا اور اُس سٹیشن پہ جا اُترا جہاں مجھے ریلوے پولیس کا وہ سب انسپکٹر مل سکتا تھا جس نے اس حادثے کی رپورٹ لکھی تھی۔

اُس سے ملا تو اُس نے لاپروائی سے بتایا کہ اس نے لکھ دیا تھا کہ لڑکی اپنی غلطی سے گر کر مری ہے۔ اسے چلتی ریل گاڑی پر سوار ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اسے کسی نے دھکا نہیں دیا تھا۔ گاڑی میں کوئی رش نہیں تھا۔ اُس نے خود کشی بھی نہیں کی۔ اگر خودکشی کرنی ہوتی تو گاڑی کے پائیدان سے نہ گرتی۔ کہیں اور ریلوے لائن پر لیٹ جاتی۔ میں نے اس سب انسپکٹر کو اپنا مسئلہ بتایا۔ اُس نے کہا کہ موقعہ کے گواہوں نے بتایا ہے کہ لڑکی کے ساتھ کوئی آدمی نہیں تھا۔ اُس نے میری اس رائے سے اتفاق کیا کہ لڑکی گھر سے بھاگ رہی

تھی لیکن اسے کہاں منزل کا پتہ نہ چل سکا کیونکہ اس کے پاس رقم تو تھی ٹکٹ نہیں تھا۔

پھندے سے نکلا، پھندے میں آگیا

میں وہاں سے بھی مایوس واپس آیا۔ دو دن اور گزر گئے۔ لڑکی کے گاؤں سے اطلاع ملی کہ لڑکی کے گھر کا وہ نوکر کہیں نظر نہیں آرہا جس کا ذکر چوکیدار نے کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ان کے گھر کا فرد لگتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اُس رات سے غائب ہے جس رات لڑکی گاڑی تلے آئی تھی لیکن گھر والوں نے مشہور کر دیا ہے کہ اُسے کام کے لئے کہیں بھیجا ہے۔ مجھے یہ سوچنا تھا کہ میں لڑکی کے متعلق اُس کے باپ سے براہِ راست معلوم کروں کہ وہ کسی کے ساتھ جا رہی تھی یا اکیلی گھر سے بھاگ رہی تھی اور اُسی رات نوکر کہاں بھیجا گیا ہے؟ میں نے سوچ سوچ کر فیصلہ کیا کہ یہ معلومات درپردہ حاصل کروں جس کا ذریعہ مُخبر، چوکیدار، نمبردار وغیرہ تھے۔ میرا مخبری کا نظام نہایت اچھا اور قابلِ اعتماد تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ لڑکی کا باپ صحیح بات بتائے گا۔

شام کو میں مخبروں کو بلا کر انہیں ہدایت دے رہا تھا۔ میرا اے۔ ایس۔ آئی رگھوناتھ بھی میرے پاس بیٹھا تھا۔ مخبروں میں ایک عورت بھی تھی جو اداکاری اور چرب زبانی میں مہارت رکھتی تھی۔ میں ابھی ان لوگوں

سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل آیا۔ وہ میرے تھانے کا نہیں تھا، دس بارہ میل دُور کے ایک تھانے سے آیا تھا۔ اُس نے مجھے ایک بند لفافہ دیا۔ کھولا اور چھٹی پڑھی۔ یہ اُس تھانے کے ایس۔ ایچ۔ او علی عمران کی تھی۔ یہ چھٹی میرے اُس نوٹس کے جواب میں تھی جو میں نے ضلعے کے تمام تھانوں کو بھیجا تھا کہ قتل کا ملزم مفرور معلوم ہوتا ہے اور اُس کی نشانی یہ ہے کہ اُس کا دایاں پاؤں زخمی ہو گا۔

یہاں میں آپ کو پھر بتا دوں کہ یہ میں نے ہوا میں یا اندھیرے میں تیر چلا رکھا تھا کہ قاتل کا دایاں پاؤں آہنی پھندے میں آ کر زخمی ہو گیا ہے۔ یہ ایک قیاس تھا۔ اس میں وثوق اور یقین والی کوئی بات نہیں تھی۔ تفتیش شکوک و شبہات پر ہی کی جاتی ہے۔ اس کیس میں تو مجھے ذرا ذرا سا شک بھی رفع کرنا تھا۔ سب انسپکٹر علی عمران نے لکھا تھا کہ ریلوے پولیس نے ایک آدمی کو ریلوے لائن پر لیٹ کر خودکشی کرنے کی کوشش میں پکڑا ہے، اور اس آدمی کا دایاں پاؤں اس طرح زخمی ہے کہ ٹخنے اور پاؤں پہ دونوں طرف کئی ایک زخم ہیں۔ یہ بلاشبہ پھندے کے دندانوں کے زخم ہیں۔

علی عمران نے بذریعہ ڈاک جواب دینے کی بجائے کانسٹیبل کے ہاتھ چھٹی بھیج دی تھی تا کہ مجھے جلدی مل جائے۔ کانسٹیبل نے یہ تفصیل سُنائی کہ مال گاڑی جا رہی تھی۔ سٹیشن سے نکلتے ہی چڑھائی شروع ہو جاتی تھی۔ علاقہ پہاڑی تھا اس لئے موڑ زیادہ تھے۔ چونکہ یہ مال گاڑی بھی

س لیے رفتار وزن، چڑھائی اور موڑوں کی وجہ سے بہت کم تھی۔ ڈرائیور نے
سے نکل کر انجن کو رفتار میں لانا تھا۔ ایک موڑ سے گاڑی مڑی تو ڈرائیور
نے دیکھا کہ تقریباً ایک سو گز دور ایک آدمی پیٹ کے بل اس طرح لیٹا
ہوا ہے کہ اس کی گردن ریل کی پٹڑی پر ہے اور وہ خود دونوں پٹڑیوں
کے درمیان پڑا ہے۔ ڈرائیور نے وسل بجائی لیکن وہ آدمی نہ ہلا۔ اگر
گاڑی کی رفتار تیز ہوتی تو گاڑی کو روکنا ممکن نہ ہوتا۔ مال گاڑی کے
ڈرائیور نے انجن کی سٹیم بند کر دی۔ اگر وہ اس آدمی کے اوپر سے
گاڑی گزار لے جاتا تو اس سے کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ
آخر انسان تھا۔ ایک تو وہ اس آدمی کو مارنے سے ڈر گیا اور اس کے
بیان کے مطابق ڈرائیور کو یہ خیال بھی آ گیا کہ یہ مردہ ہے اور کوئی اسے
مار کر لاش لائن پر رکھ گیا ہے۔

میں نے آپ کو ایسی کہانیاں سنائی ہیں جن میں کسی کو کہیں اور
گلا دبا کر قتل کیا گیا اور رات کو لاش لائن پر رکھ دی گئی۔ تیز رفتار گاڑی
روکی نہیں جا سکتی۔ گاڑی لاش کو کاٹتی گزر گئی۔ قاتل خوش ہوتے کہ اب
لوگ سمجھیں گے کہ یہ آدمی گاڑی کے نیچے آکر مرا ہے، مگر قاتل پھر بھی
پکڑے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی کو ہلاک کر کے لاش کو لائن
پر رکھوا دو لاش کٹ جاتے تو خون نہیں نکلتا جس سے پتہ چل جاتا ہے
کہ یہ آدمی پہلے مرا ہوا تھا اور اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ میں آپ کو اپنے
تجربے کی روشنی میں بتا دوں کہ جرم کر کے کوئی سزا سے بچ نہیں سکتا۔

قانون کی گرفت سے بچ جاتے تو خدا اُسے کسی اور طریقے سے سزا دے دیتا ہے۔

مال گاڑی کے ڈرائیور نے انجن کی سُست رفتار سے فائدہ اُٹھایا اور آہستہ آہستہ بریکیں لگانی شروع کیں۔ وہ آدمی بالکل نہیں ہلا۔ انجن اُس سے ایک گز دُور رُک گیا۔ ڈرائیور اور انجن کے دوسرے دو آدمی انجن سے کود دے اور جب وہ اس آدمی تک پہنچے تو اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ گاڑی رُکی کھڑی ہے۔ وہ اُٹھ کر بھاگا لیکن ڈرائیور نے اسے دُور نہ جانے دیا۔ مال گاڑی کے ساتھ پولیس کی گارد بھی جا رہی تھی۔ ایک ہی سال پہلے ایک مال گاڑی کو ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے روک کر لُوٹ لیا تھا، اس لئے اس علاقے سے گزرنے والی مال گاڑیوں کے ساتھ پولیس کی مسلح گارد بھیجی جاتی تھی۔ اس آدمی کو گارد کے حوالے کر دیا گیا۔ گارد کے کمانڈر نے اُسے اگلے سٹیشن پر ریلوے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس طرح وہ علی عمران کی حراست میں آیا۔

علی عمران نے اُسے اچھی طرح دیکھا تو اُس کے دائیں پاؤں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے پوچھا کہ یہ زخم کیسا ہے تو اُس نے بتایا کہ پاؤں پر کلہاڑی لگی ہے۔ میں نے اپنے نوٹس میں جو میں نے تمام تھانوں کو بھیجا تھا، یہ بھی لکھا تھا کہ ملزم کا پاؤں دندانوں والے لوہے کے پھندے میں آیا ہے۔ علی عمران نے اُس کی پٹی کھلوائی تو یہ زخم کلہاڑی کا نہیں تھا بلکہ یہ کئی زخم تھے جو دندانوں کے ہو سکتے تھے۔ اُس نے مجھے

اطلاع دے دی۔

غُربت بھی، محبّت بھی

میں اُسی رات کی گاڑی سے اس کانسٹیبل کے ساتھ علی عمران کے تھانے جا پہنچا۔ آدھی رات گزُر گئی تھی۔ اُسے جگایا اور اُسی وقت حوالات سے اس آدمی کو نکال کر کمرے میں بٹھا لیا۔ علی عمران سے کہا کہ وہ جا کر سو جائے۔ میں نے ملزم سے پوچھا کہ وہ لائن پر کیوں لیٹا ہُوا تھا۔

"خودکُشی کے لئے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"خودکُشی کی وجہ؟"

"زندگی سے تنگ آ گیا ہوں"۔

"اصل وجہ بتاؤ"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "کیا تنگی تھی؟ غُربت؟ محبّت؟ کوئی اور وجہ؟"

"غُربت بھی اور محبّت بھی"۔

"کس سے محبت تھی؟"

وہ خاموش رہا۔ میں نے اپنا سوال دُہرایا۔ وہ پھر بھی خاموش رہا۔ میں نے اُس کے سَر پر ہاتھ رکھ کر ہلایا اور ایک بار پھر پوچھا کہ اُسے کس سے محبت تھی۔

"میری آنکھوں پر جلتے ہوتے انگارے رکھ دیں" — اُس نے کہا — "میرے ہاتھوں پر انگارے رکھ کر جلا دیں۔ میں اُس کا نام نہیں بتاؤں گا۔"

مَیں نے اُس کا لب و لہجہ خاص طور پر نوٹ کیا۔ وہ دیہاتی تھا مگر اُس کے لہجے میں پولیس کا ڈر نہیں تھا۔ اس کی باتوں میں بڑک مارنے والا جوش بھی نہیں تھا بلکہ اُس کی زبان میں غم تھا اور اُس کی دبی دبی آواز میں خود اعتمادی بھی تھی۔ مَیں نے اُس سے دو تین بار پوچھا کہ اُسے کس سے محبت تھی مگر اُس نے یہی جواب دیا — "کبھی نہیں بتاؤں گا۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

اُس نے جس گاؤں کا نام لیا وہ مقتول کا گاؤں نہیں تھا اور وہ اس لڑکی کا بھی گاؤں نہیں تھا۔ اُس نے ریلوے پولیس کو یہی گاؤں بتایا تھا۔ میں نے اُس سے پاؤں کے زخم کے متعلق پوچھا تو اُس نے وہی جواب دیا جو علی عمران کو دے چکا تھا — "کلہاڑی لگی ہے" — میں نے اُسے کھولنے کو کہا تو اُس نے پٹی کھول دی جو ہسپتال کی پٹی نہیں عام سا کپڑا تھا۔ اس پر ہلدی کے رنگ کی دو انچوں کے برابر بڑے دھبے تھے۔ میں نے اُس کا ننگا پاؤں دیکھا اور پوچھا — "کلہاڑی دندانوں کی طرح تھی؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے چونکہ وہ پھندا دیکھا تھا اس لئے میرے لئے کوئی شک نہ تھا کہ یہ

پاؤں پھندے میں آیا تھا۔ ٹانگ پر ٹخنے کے دونوں طرف دندانے اترنے کے تین تین زخم تھے۔ پاؤں کے اوپر والے حصے پر بھی دندانے اترے ہوتے تھے۔ اس کی جوتی پر بھی دندانوں کے صاف نشان تھے۔ جوتی میں دو تین سوراخ تھے۔ ایک مہینے سے کچھ دن اوپر ہو گئے تھے، زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی وہ دیسی علاج کرتا رہا تھا اور دوسری وجہ یہ کہ یہ پاؤں کے زخم تھے جن پر جسم کا وزن پڑتا رہتا تھا۔ اس کے اس جھوٹ نے کہ کلہاڑی لگی ہے مجھے گہرے شک میں ڈال دیا۔

"اس پاؤں پر کلہاڑی نہیں لگی" — میں نے اسے کہا — "اب تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔"

وہ اس محاورے کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اَن پڑھ ہونے کے علاوہ وہ تجربے کی عمر میں ابھی داخل نہیں ہوا تھا۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال تھی اور وہ اچھی بھلی شکل و صورت اور بڑے اچھے جسم کا نوجوان تھا۔

لڑکی کے ساتھ یہی تھا

"یہ پاؤں قتل کے بعد پھندے میں آیا تھا یا پہلے؟" — میں نے رازداری سے پوچھا۔

اُس نے مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ بہت ہی دھیمی آواز میں بولا۔ "میں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا" ۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔

"یہ پاؤں پھندے میں نہیں آیا تھا" میں نے کہا۔ "جھوٹ بولو گے تو ان زخموں میں نمک ڈال کر تمہیں اُلٹا لٹکا دوں گا۔ اگر سچ بولو گے تو فائدے میں رہو گے۔ میں تمہیں بچا لوں گا۔ تمہیں اس لئے گرفتار نہیں کیا گیا کہ تم ریلوے لائن پر لیٹے ہوتے تھے۔ تمہارا جرم یہ ہے کہ تم قاتل ہو۔"

میں نے دو ٹکٹ اُس کے آگے رکھ دیئے۔ یہ علی عمران نے جامہ تلاشی میں اُس کی جیب سے نکالے تھے۔ میں جب یہاں آیا تو اس نے یہ ٹکٹ مجھے دیئے تھے۔ اُس کی جیب سے تھوڑی سی نقدی بھی برآمد ہوئی تھی۔ یہ ٹکٹ اُس سٹیشن سے خریدے گئے تھے جہاں لڑکی گاڑی سے گر کر مری تھی۔ بکنگ کلرک نے کہا تھا کہ ایک آدمی نے دو ٹکٹ خریدے تھے۔ وہ آدمی یہی ہو سکتا تھا۔

"تم نے دو قتل کیے ہیں" — میں نے اُس کا دم خم ختم کرنے کے لئے کہا۔ "اس لڑکی کو تم نے گاڑی سے گرایا اور اُسے گاڑی کے نیچے پھینکا تھا۔ وہاں تمہیں تین آدمیوں نے شناخت کیا تھا۔ ٹکٹ بابو تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہے" — میں نے اُس سے پوچھا — "تم نے لڑکی کو کیوں قتل کیا ہے؟"

وہ پیشہ ور مجرم نہیں تھا اور وہ پختہ عمر کا بھی آدمی نہیں تھا۔ نوجوان لڑکا تھا۔ اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نظر آنے لگے۔ ہکلا کر آہستہ سے بولا — "مجھ سے کوئی سی قسم لے لو، میں نے لڑکی کو گاڑی سے دھکہ نہیں دیا تھا۔ مجھ پر جھوٹا الزام نہ لگائیں۔"

"تم اُس کے ساتھ تھے پھر وہ گری کیسے؟" — میں نے اُسے جال میں لیتے ہوئے کہا — "اور جب وہ گر پڑی تو تم وہاں سے غائب کیوں ہو گئے تھے؟"

"گاڑی چل پڑی تھی" — اُس نے کہا — "میں پہلے اُسے سوار کرانا چاہتا تھا۔ وہ گاڑی کا اگلا ڈبہ تھا۔ وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑی۔ میں اُس کے بالکل پیچھے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ گاڑی تیز نہیں تھی مگر پلیٹ فارم ختم ہو گیا۔ وہ ایسی گری کہ لڑھک کر گاڑی کے نیچے چلی گئی۔ میں گرتے گرتے سنبھل گیا۔ مجھے اُس کی چیخ سنائی دی۔ گاڑی گزر گئی۔ میں نے اُسے دیکھا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں الگ اور ایک بازو الگ پڑا تھا۔ ذرا آگے جا کر گاڑی رُک گئی۔ سٹیشن کی طرف سے کچھ آدمی دوڑے آ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ لڑکی مر گئی ہے۔ میں وہاں سے بھاگ گیا۔"

یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ گارڈ نے لڑکی کو گرتے اور گاڑی کے نیچے جاتے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی اُسی نے روکی تھی۔

"تم لڑکی کو گھر سے بھگا کر لے جا رہے تھے؟"

اُس نے بے دلی سے سر ہلایا۔ وہ لڑکی کو بھگا کر لے جا رہا تھا۔

"اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اُس کے منگیتر کو قتل کرنا کیوں ضروری سمجھا؟"—میں نے پُوچھا۔

اُس نے میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔ اُس پر نیند کا اثر تو تھا لیکن وہ میرے جس جال میں آ گیا تھا اس نے اُس کے دماغ کو میرے قبضے میں دے دیا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی، اور پیار کی باتیں شروع کر دیں۔ اُس کا حوصلہ بڑھایا اور اُسے اقبالِ جُرم کے لئے تیار کر لیا۔

"مجھے جلدی پھانسی دے دو گے؟"—اُس نے پُوچھا۔

"میں تمہیں پھانسی سے بچا رہا ہوں"—میں نے کہا—"اور بچا لوں گا۔"

"یہ تو کوئی مہربانی نہ ہوتی"—اُس نے کہا—"میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔"

"تمہاری ہر خواہش پُوری کروں گا"—میں نے کہا—"تمہارے لئے جو بہتر سمجھوں گا وہ کروں گا۔ پہلے مجھے سارا واقعہ سُنا دو۔ بات وہاں سے شروع کرو کہ تم نے لڑکی کے منگیتر کو کیوں اور کس طرح قتل کیا تھا۔"

اُس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن اس موقع پر اُس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے ضمیر پر جو بوجھ تھا اسے ضمیر سے اُتارنے میں میں اُس کی مدد کر رہا تھا۔

وہ ملبے میں زندہ رہا

"آپ میری ساری کہانی سُنیں گے؟" اُس نے التجا کے لہجے میں کہا۔ "یہ سُن کر آپ کے دل میں رحم پیدا ہو جائے گا۔ میں مرنے سے پہلے یہ کہانی ضرور سُنانا چاہتا ہوں۔"

"میں پوری توجہ سے سُنوں گا" — میں نے کہا۔

اُس نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ جالندھر کا رہنے والا ہے اور وہ کوئٹہ میں پیدا ہُوا تھا۔ وہاں اُس کے باپ کی بہت بڑی دکان تھی اور وہ بڑے مزے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کی عمر سات آٹھ سال تھی جب باپ اُسے اُس کی ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ جالندھر لایا تھا۔ وہاں اس کی دادی اور دادا تھے۔ اُس کی ماں کے ماں باپ مر گئے تھے اور اُس کے قریبی رشتہ دار کوئی بھی نہیں تھے۔ وہ جالندھر آئے تو دادا مر گیا۔ اُس کے باپ نے جالندھر والا مکان بیچ ڈالا اور اس کی دادی کو اپنے ساتھ کوئٹہ لے گیا۔ اس طرح جالندھر سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس کے باپ نے کوئٹہ میں ایک پُرانا مکان خرید لیا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے باپ نے جالندھر میں کیوں دکان نہ کھولی اور کوئٹہ کیوں چلا گیا تھا۔

اُس کی عمر دس گیارہ سال ہوئی تو کوئٹہ میں وہ تاریخی زلزلہ آیا

جس نے اتنے بڑے شہر کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ یہ جون ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے اور یہ زلزلہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کوئٹے کی تباہی کی جو تفصیل سُنی تھی وہ آج بھی یاد آتی ہے تو دل دہل جاتا ہے۔ رات کے آخری پہر زمین کے اندر بڑی خوفناک گڑگڑاہٹ سُنائی دی اور اتنے سخت جھٹکے آئے کہ مکان ریت کے گھروں کی طرح بیٹھ گئے۔ تمام مکان پُرانے زمانے کے تھے۔ لوگ گہری نیند سوتے ہوتے تھے۔ کسی کو بھاگنے کی مہلت نہ ملی۔ بھاگتے بھی تو کہاں جاتے۔ گلیاں ملبے سے بند ہو گئی تھیں۔ زلزلہ ایک ہی بار نہیں آیا۔ جھٹکوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے ساتھ زمین کے نیچے کی گڑگڑاہٹ زمین کے اندر بھاگتی دوڑتی محسوس ہوتی تھی اور زمین پھٹ رہی تھی۔ صرف چھاؤنی کا علاقہ اور ریلوے سٹیشن محفوظ رہا تھا۔

فوج نے لوگوں کو ملبے کے نیچے سے نکالنے کا کام شروع کیا۔ زیادہ تر لاشیں نکلتی تھیں۔ کہیں کہیں سے زندہ انسان بھی نکلے۔ یہ کام اتنا مشکل تھا کہ پانچ سات دنوں بعد یہ فرض کر کے کہ اب ملبے میں کوئی زندہ نہیں رہا ہو گا، ملبہ ہٹانے کا کام بند کر دیا گیا۔ اموات زیادہ اور بچنے والوں کی تعداد کم تھی۔ ان میں زیادہ تر زخمی تھے۔

"مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ ایک فوجی نے مجھے اپنے بازوؤں پر اُٹھا رکھا تھا" — ملزم نے کہا — "اور میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میں اب جاگا ہوں۔ زلزلے کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ فوجیوں نے ملبے کے

قریب ہی میرے سر پر پٹیاں باندھیں۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میرے سر میں چوٹ لگی تھی اور میں نیند سے غشی میں چلا گیا تھا۔ میں رونے لگا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہر طرف زخمی تھے اور لاشیں پڑی تھیں۔ میں اپنے گھر کو ڈھونڈ رہا تھا مگر وہاں کوئی مکان کھڑا نہیں تھا۔ مجھے ملبے سے نکالنے والا فوجی مسلمان تھا۔ وہ مجھے بہلانے لگا۔ میں اپنی امّی اور ابّا کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا۔ یہ فوجی مجھے ایک طرف لے گیا اور دو لاشوں کے مُنہ ننگے کئے۔ یہ میری امّی اور میرے ابّا کی لاشیں تھیں۔ مجھے میرے بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کی اور دادی کی لاشیں بھی دکھائی گئیں۔ اپنے مکان میں سے صرف میں زندہ رہا تھا۔"

اُس کی آواز دب گئی اور وہ سر جھکا کر ہچکیاں لیتا رہا۔ میں نے اُس کے لئے پانی منگوایا۔ اُسے پلایا اور دلاسہ دیا۔ آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ اپنی ماں، اپنے باپ اور اپنے بہن بھائی کی لاشیں دیکھ کر دس گیارہ سال کی عمر کے بچّے کی کیا حالت ہوتی ہو گی۔ اُس نے مجھے اپنی اُس وقت کی حالت سُنائی۔ ایک بار تو روکنے کے باوجود میرے آنسو نکل آئے۔ اسے چھاؤنی میں لے گئے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس طرح کے بچّوں کے لئے کیا انتظامات کئے گئے تھے۔ اسے یہی معلوم تھا کہ یہ فوجی اپنے بال بچّوں کے ساتھ کوارٹر میں رہتا تھا اور وہ اُسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اُس نے بچّے سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں کا رہنے

والا ہے۔ بچے نے بتایا تھا کہ اس کے والدین جالندھر کے رہنے والے تھے لیکن جالندھر میں اُن کا اپنا عزیز رشتہ دار کوئی نہیں رہا۔

لڑکی نے اسے نوکر نہ سمجھا

تین چار ماہ بعد یہ فوجی اسے اپنے گاؤں لے آیا۔ وہ چھٹی آیا تھا اور وہ اُس وقت صوبیدار تھا۔ اُس کے متعلق ملزم نے بتایا کہ اُس کے بچے تھے اور وہ اُس کے ساتھ اپنے بچوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ صوبیدار اسے جس گاؤں میں لایا وہ اس لڑکی کا گاؤں تھا جو گاڑی سے گر کر کٹ گئی تھی۔ صوبیدار اُن کا قریبی رشتہ دار تھا۔ میں قتل کی جو واردات سُنا رہا ہوں یہ ۱۹۴۴ء کی ہے۔ یہ صوبیدار اُس وقت زندہ نہیں تھا۔ دو سال پہلے برما فرنٹ پر مارا گیا تھا۔ وہ بچے کو کہتے ہے سے لے آیا اور گاؤں والوں کو سُنایا کہ اپنے خاندان میں یہ اکیلا بچہ زندہ بچا ہے اور اسے وہ رحم کے جذبے سے لے آیا ہے۔ گاڑی کے نیچے آنے والی لڑکی کے باپ نے صوبیدار سے بچہ لے لیا۔ اُس وقت لڑکی کی عمر اس بچے جتنی تھی، یعنی دس گیارہ سال۔ لڑکی کے باپ کے ساتھ حادثہ یہ ہو رہا تھا کہ اس لڑکی کے سوا اُس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دو بچے پیدا ہوئے اور مر گئے تھے۔ اُس نے صوبیدار سے یہ بچہ لے لیا۔ بعد میں جب میں نے لڑکی کے باپ کے بیان لیتے تھے تو اُس نے بتایا تھا کہ اُس

نے اس بچے کو متبنیٰ نہیں بنایا تھا بلکہ اسے اس لئے لیا تھا کہ اُس کی بچی کا گھر میں ساتھ رہے گا اور یتیم اور بے آسرا بچے کو پالنے کا ثواب بھی ملے گا۔ اُس نے بتایا کہ بچہ صاف ستھرا، سُلجھا ہُوا اور خوبصورت تھا۔ وہ خوشحال زمیندار تھا۔ ایسے زمینداروں کے ہاں صرف روٹی کی خاطر لوگ خوشی سے نوکری کرتے تھے۔ ان زمینداروں کے طور طریقے بادشاہوں جیسے تھے۔ اس بچے کو اسی زمیندار نے بادشاہی شغل کے طور پر رکھ لیا۔

ملزم نے اپنے بیان میں کہا کہ ان اجنبی لوگوں میں اور اس ماحول میں وہ اتنا گھبرایا کہ ہر وقت وہاں سے بھاگ نکلنے کی سوچتا رہتا مگر اُسے جب باپ، دادی، ماں اور بہن بھائی کی لاشیں یاد آتیں تو اُسے ایسے لگتا جیسے کسی نے اس کا گلا مضبوط ہاتھوں میں دبا لیا ہو۔ کہاں کوئٹہ کا شہر اور کہاں یہ دیہاتی ماحول۔ بچہ بڑے اچھے سکول میں پڑھتا تھا۔ یہاں گاؤں میں پڑھنے پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا۔ اسے گاؤں کے بچے گندے لگتے تھے اور اسے وہاں کی ہر چیز سے ڈر آتا تھا۔ زمیندار اور اُس کی بیوی نے اسے اپنے بچے کی طرح رکھا۔ اسے اچھے کمرے میں سُلاتے تھے اور اسے اپنی بچی کے ساتھ کھانا دیتے تھے۔

زمیندار کی بچی بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتی تھی اور اسے اپنے ساتھ لگائے رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اس کی ہم عمر تھی۔ وہ آخر بچہ تھا۔ اس کا ذہن اس ماحول اور اس کے انسانوں کو قبول کرنے لگا۔ سب سے بڑی ضرورت شفقت اور پیار ہے۔ بچے کی یہ ضرورت

پوری ہو رہی تھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اُس کے ذہن سے اُس کے ماں باپ کی اور کوئٹہ کی زندگی کی یاد اُتر جاتی۔ اُسے جب یہ یادیں آتی تھیں تو اُس کے لئے سنبھلنا اور اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ وہ زمیندار کی بیٹی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بچی اُس کی دلی کیفیت کو سمجھنے لگی تھی۔ ایک روز اس بچی نے اُسے کہا کہ وہ اسے کوئٹہ کی باتیں سُناتے۔

بچے نے اُسے پوری تفصیل سے سُنایا کہ اس کی ماں کیسی تھی، باپ کیسا تھا، ننھی سی بہن کیسی تھی اور اس کا گھر کیسا تھا اور وہ کتنے اچھے اچھے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ اُس نے شہر کی زندگی ایسے انداز سے سُنائی کہ بچی کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "یہ گاؤں تو بڑے گندے ہیں۔ ہم بڑے ہوں گے تو ہم دونوں کسی شہر میں چلے جائیں گے"۔ بچے کو بچی کی یہ بات بہت پسند آئی بلکہ اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ اس کے بعد بچے نے اُسے کوئٹے کی تباہی کی داستان سُنائی۔ یہ اتنی بھیانک اور ہولناک تھی کہ بچی ڈر کر اس کے قریب ہو گئی۔ بچے کے آنسو نکل آئے۔ بچی کے دل میں بچے کی محبت اور زیادہ گہری ہو گئی۔ اس محبت میں ہمدردی زیادہ تھی۔

جب دونوں جوان ہوئے تو ...

یہ دونوں گھر میں بھی کھیلتے، کھیتوں میں بھی چلے جاتے اور

وقت گزرتا چلا گیا۔ ملزم لباس اور عادات کے لحاظ سے دیہاتی بنتا چلا گیا۔ اسی علاقے کے لب و لہجے میں وہیں کی زبان بولنے لگا۔

"لیکن کوئٹہ اور اپنا گھر اور اپنے ماں باپ اور بہن بھائی دِل سے نہیں اُترتے تھے"۔ ملزم نے تھانے میں مجھے بیان دیتے ہوئے کہا۔ "ان سب کی لاشیں آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غصہ آتا تھا اور دل پر غم کا بوجھ رہتا تھا۔ یہ لڑکی اتنی اچھی تھی کہ مجھے زیادہ دیر غمگین نہیں رہنے دیتی تھی۔ اسے اور کچھ کہنا نہیں آتا تھا تو یہی کہہ دیتی تھی کہ ہم بڑے ہو کر شہر چلے چلیں گے۔"

دونوں پندرہ سولہ سال کی عمر کو پہنچے تو ملزم گھر کے کام بھی کرنے لگا۔ دیہات میں فصل اُٹھانے، بازار بھجوانے وغیرہ سے متعلق کام قابلِ اعتماد اور عقلمند نوکر کیا کرتے ہیں۔ زمین جائیداد والوں کے کئی کام ایسے ہوتے ہیں جو ہر نوکر سے نہیں کرائے جاتے۔ یہ کام آہستہ آہستہ ملزم کے سپرد ہونے لگے اور وہ دلچسپی سے کرنے لگا۔ اُس کی حیثیت گھر کے فرد کی بھی ہو گئی اور نوکر کی بھی۔ لڑکی اب جوان ہو گئی تھی۔ وہ اب ملزم کے ساتھ پہلے کی طرح کھیل نہیں سکتی تھی لیکن ملزم کے ساتھ اُس کی دلچسپی پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ وہ اُس کے کھانے پینے کا اور کپڑوں کا خود خیال رکھتی تھی۔ چونکہ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اس لئے لاڈلی تھی۔ ماں باپ اس کی ہر بات مانتے تھے۔ انہوں نے جوان ہونے کے باوجود بیٹی کو لڑکے کے ساتھ اتنا زیادہ بے تکلف

ہونے سے نہ روکا۔

اب اُن کی بے تکلفی کا رنگ بدل گیا تھا۔ تنہائی میں ہوتے تو لڑکی بعض اوقات شرما جاتی تھی۔ لڑکے کے ذہن سے کوٹھا اور شہری زندگی نکلی نہیں تھی۔ اب وہ بھلا بُرا سوچ سکتا تھا اور اُس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گاؤں میں نہیں رہے گا لیکن لڑکی اُس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ ان کے بچپن کے کھیل اب جوانی کا کھیل بن گیا تھا جسے پردوں میں چھپ کر کھیلا جاتا ہے۔ ملزم نے خدا اور قرآن کی قسمیں کھا کر کہا کہ ان کی محبت بالکل پاک تھی اور دونوں نے کبھی ایسی ویسی بات نہیں سوچی تھی۔ ملزم کو یہ پورا احساس تھا کہ لڑکی کے گھر والے اُس پر اعتبار کرتے ہیں۔

لڑکا شہری ماحول اور شائستہ گھرانے کا پروردہ تھا لیکن اس پر دیہاتی پن غالب آچکا تھا۔ وہ دلیر اور اکھڑ بن گیا۔ تعلیم سے وہ بے بہرہ رہا تھا۔ یہ اثرات بھی تھے کہ اس لڑکی کو وہ اپنی ملکیت سمجھنے لگا۔ اُسے اپنی ملکیت کا تاثر لڑکی نے ہی دیا تھا۔ لڑکی لاڈلی ہونے کی وجہ سے ضدی اور اکھڑ تھی۔ صرف ملزم کے آگے وہ جھکتی اور اس کی ہر بات مانتی تھی۔ ملزم نے یہ کسی بھی وقت نہ سوچا کہ اُن کی محبت کا انجام کیا ہوگا۔ وہ جب اور بڑے ہوتے تو سب کے سامنے ہنسنے کھیلنے سے گریز کرنے لگے لیکن ان کا میل جول رُک نہ سکا۔ ایک سہولت گھر والوں نے خود ہی دے رکھی تھی۔ لڑکی کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں دوسرے گاؤں جانا ہوتا تو ملزم کو اُس کے ساتھ بھیجا جاتا تھا۔ لڑکی گھوڑی پر ہوتی اور لڑکا پیدل۔

لڑکی اکثر اِدھر اُدھر جانے لگی۔ وہ سیر کی اتنی شوقین نہیں تھی، وہ ملزم کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ ملزم نے مجھے بتایا کہ راستے میں وہ رُک جاتی اور اُسے پاس بٹھا کر دِل کی باتیں کرتی اور سُنتی تھی اور کبھی تو وہ بچی بن جاتی اور کہتی کہ میں بھاگتی ہوں تم مجھے پکڑو۔ ملزم اُس کے پیچھے دوڑتا اور تھوڑی دور جا کر اُسے پکڑ لیتا۔ لڑکی اُس کے ساتھ لپٹ جاتی۔ کبھی گر پڑتی اور ملزم کو اپنے اُوپر گرا لیتی لیکن اُس کا انداز بچپنے والا ہوتا تھا۔

لڑکی کی منگنی کہیں اور ہو گئی

ملزم نے مجھے بہت سی باتیں سنائیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی اس کے بغیر خوش نہیں رہتی تھی اور اسے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے ساتھ لگائے رکھنے کے موقعے پیدا کرتی رہتی تھی۔ مجھے اُس کی اتنی زیادہ باتیں سُننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہر ایک بات مجھے سُنا کر شاید سکون محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اکتاہٹ کا اظہار نہ کیا بلکہ ایسا رویّہ اختیار کر لیا جیسے میں اُس کا بے تکلّف دوست ہوں۔ مجھے جب یاد آتا تھا کہ میں تھانیدار ہوں تو میں بے تاب ہو جاتا کہ وہ فوراً قتل کا اقبال کر لے، اور جب میں ایک عام انسان کی حیثیت سے اُس کی طرف توجہ دیتا تھا تو میری تمام تر ہمدردیاں اُس کے ساتھ ہو جاتی تھیں۔ مجھے اُس پر رحم آتا

تھا۔ پھر میں اُس کا ہمراز دوست بن کر اُس کی باتیں ہمدردی سے سُنتا اور دلچسپی کا اظہار بھی کرتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا بڑا پیارا بچہ تھا مگر اس گاؤں میں لوگ اسے اس زمیندار کا نوکر کہتے تھے۔

دونوں کی عمر بیس اکیس سال ہو گئی۔ ایک روز لڑکی نے اُسے بتایا کہ ماں باپ اُس کی شادی کی باتیں کر رہے ہیں اور تین گھروں سے پیغام آرہے ہیں۔ ملزم کو ایسے لگا جیسے کوئٹے کا زلزلہ ایک بار پھر آگیا ہو۔ دونوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کی شادی نہیں ہو سکتی اور لڑکی برادری کے کسی گھر میں جائے گی۔ ملزم پر غم کا ایسا بوجھ پڑا کہ وہ بجھ کے رہ گیا۔ لڑکی نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ ملزم کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ ماں ابھی تک سمجھ رہی تھی کہ اُس کی بیٹی ابھی بچی ہے اس لئے اُسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ماں نے اُسے سمجھایا بجھایا کہ اگر اُس کے باپ کو پتہ چل گیا تو وہ ملزم کو گھر سے نکال دے گا اور ہو سکتا ہے کہ کسی شک میں وہ ملزم کی پٹائی بھی کر دے۔

لڑکی نے یہ باتیں ملزم کو سُنائیں اور کہا کہ وہ کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ ملزم نے اُسے کہا کہ ماں باپ نے اُسے بڑے لاڈ اور پیار سے پالا پوسا ہے اور اُس کی شادی کے نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھتے رہے ہیں اس لئے وہ ان کی امیدوں اور خوابوں پر اس طرح پانی نہ پھیرے۔ ملزم نے اُسے یہ بھی کہا کہ میں گاؤں سے چلا جاتا ہوں۔ لڑکی نے کہا کہ تم چلے جاؤ گے تو میں بھی یہاں نہیں رہوں گی۔ مختصر

یہ کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی زنجیروں میں جس بری طرح جکڑے گئے تھے انہیں توڑنا ان کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

پھر لڑکی کی منگنی ہو گئی۔ دیہاتی معاشرے میں لڑکیوں کی پسند اور مرضی کون دیکھتا ہے بلکہ اسے جرم سمجھا جاتا ہے۔ ملزم کا ردِ عمل یہ تھا کہ اُسے غصہ آنے لگا۔ غصے والی بات نہ ہوتی تو بھی اُسے غصہ آ جاتا۔ مویشیوں کو بلاوجہ مارتا اور لڑکی اس کے ساتھ بات کرتی تو اُس کے ساتھ بے رُخی سے بولتا اور کبھی اُسے ڈانٹ بھی دیتا۔ لڑکی نے اپنے باپ کی ڈانٹ کبھی برداشت نہیں کی تھی لیکن ملزم کی ڈانٹ سُن کر وہ سر جُھکا لیتی اور اکیلے جا کر روتی رہتی۔ ایک روز لڑکی نے اسے کہا کہ منگنی اُس نے خود نہیں کرائی، اُسے بتائے بغیر کی گئی ہے اور وہ ملزم کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کو تیار ہے۔ ملزم کو یہ اقدام پسند نہیں تھا کیونکہ لڑکی کے ماں باپ اس پر بھروسہ اور اعتماد کرتے تھے اور انہوں نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا اور پیار کیا تھا۔

لڑکی کی منگنی مقتول کے ساتھ ہوئی تھی جو ڈیڑھ دو میل دور گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے متعلق لڑکی کو اپنے گاؤں کی دو تین لڑکیوں سے پتہ چلا کہ چال چلن کا اچھا نہیں اور بھٹے پر کام کرنے والی ایک مزدور لڑکی کے ساتھ اُس کا میل جول ہے جس نے اُسے بہت بدنام کر رکھا ہے۔ پھر لڑکی کو بھی کچھ پتہ چلتا رہا کہ اُس کا منگیتر آوارہ اور بدکار ہے اور اُسے صرف شکار کا شوق ہے۔ لڑکی تو ویسے بھی اُسے قبول نہیں کر رہی تھی،

اُس کے متعلق یہ باتیں سُنیں تو وہ اور زیادہ پریشان ہوئی۔ اُس نے ملزم کے ساتھ بات کی اور پھر کہا کہ چلو بھاگ چلیں۔ ملزم رضامند نہ ہُوا۔

ایک روز گاؤں کے ایک آدمی نے جو اس کا دوست تھا ملزم سے کہا کہ لڑکی کا منگیتر کہتا ہے کہ میں اس آدمی (ملزم) کو اس گھر سے نکلوا دوں گا کیونکہ میں نے سُنا ہے کہ یہ میری منگیتر کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اُسے ورغلاتا رہتا ہے۔ یہ سُن کر ملزم طیش میں آگیا۔ پھر ایک روز منگیتر اور ملزم کا آمنا سامنا کھیتوں میں ہو گیا۔ ملزم اپنے گاؤں کے کھیتوں میں تھا۔ لڑکی کا منگیتر وہاں آگیا اور اُسے شہزادوں کی طرح رعب سے کہا۔ "اوئے! تم نوکر ہو یا اُس (لڑکی) کے چچا کے بیٹے ہو۔ پھر کبھی اُس کے ساتھ باہر نکلے تو خون پی لوں گا۔ تم ہمارے نوکر ہو۔ وہ میری منگیتر ہے۔ تم اپنے آپ میں رہو۔ شادی کے بعد تمہیں مویشیوں والے مکان میں رکھوں گا۔"

ملزم نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اپنے کھولتے ہوئے خون اور غصے پر قابو پانا اُس کے لئے مشکل ہو گیا۔ اُس نے لڑکی کو بتایا۔ لڑکی نے ملزم کو ڈانٹ کر کہا — "تم نے یہ بے عزتی کس طرح برداشت کر لی؟ تم خاموش کیوں رہے تھے؟"

"اس لئے کہ میں اس گھر میں نوکر ہوں۔"

"جس دن تمہیں اس گھر میں کسی نے نوکر کہا اُس دن نہ تم اس گھر میں رہو گے نہ میں رہوں گی۔" — لڑکی نے اُسے کہا — "پھر کبھی وہ لفنگا تم سے ایسی بات کرے تو ہماری ذات کے مردوں کی طرح اُس کا مُنہ توڑ دو۔"

"مجھے صرف تمہاری عزت کا خیال آتا ہے" — ملزم نے کہا — "لوگ تمہیں بدنام کر دیں گے۔"

"میری عزت تمہارے ہاتھ ہے" — لڑکی نے کہا — "میں اپنے ماں باپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔ یہ بات انہیں بتاؤں گی تو وہ اس کی طرفداری کریں گے۔ آئندہ تم اس کا یہ رعب برداشت نہ کرنا۔"

منگیتر کے پاس بندوق تھی

لڑکی کی حوصلہ افزائی اور اس کی محبت نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔ ملزم پہلے ہی غصے سے بھڑکا رہتا تھا۔ دوسرا موقعہ جلدی آگیا۔ لڑکی لڑکیوں کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے کھیتوں میں گئی۔ وہ ملزم سے کہہ گئی تھی کہ وہاں آجانا۔ وہ کسی بہانے چلا گیا۔ لڑکی لڑکیوں سے الگ ہو کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اُدھر سے لڑکی کا منگیتر (مقتول) گھوڑے پر سوار اُدھر آنکلا۔ اس نے ان سے کچھ دور گھوڑا روک کر ملزم کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور اُسے ماں کی گالی دے کر کہا — "میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تمہیں اس گھر سے نکلوا دوں گا۔ اب اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو کل سورج غروب ہونے سے پہلے اس گاؤں سے نکل جاؤ۔ اگر نہ گئے تو گاؤں سے باہر قدم نہ رکھنا۔ تمہاری لاش کسی کو ملے گی نہیں" — یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ملزم وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ لڑکی پرے چلی گئی تھی۔ رسم و رواج کے مطابق وہ اپنے منگیتر کے ساتھ بات نہیں کر سکتی تھی۔ ملزم کے اندر ایسی ہلچل بپا ہو گئی جسے وہ میرے سامنے اچھی طرح بیان نہ کر سکا۔ میں اُس کی اُس وقت کی جذباتی کیفیت سمجھ گیا۔ اس نے لڑکی کے منگیتر کا چیلنج قبول کر لیا تھا اور غور کئے بغیر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بے عزتی کا انتقام لے گا۔ اس کے اندر جو غصہ بھرا رہتا تھا وہ اس فیصلے کے ساتھ ہی سکون اور اطمینان میں بدل گیا۔ لڑکی نے اس سے پوچھا کہ اُس نے کیا کہا تھا۔

"تم نے ایک روز مجھ سے کہا تھا کہ پھر کبھی لفنگا ایسی بات کرے تو ہماری ذات کے مردوں کی طرح اُس کا منہ توڑ دو"۔۔۔ اس نے لڑکی سے کہا۔۔۔ "اب میں مردوں کی طرح اُس کا منہ توڑ کر تمہیں بتاؤں گا کہ اُس نے کیا کہا تھا۔"

جیسا کہ آپ کو بتا چکا ہوں کہ ملزم دیہات کے رنگ میں رنگا گیا تھا۔ اس نے بے عزتی کا بدلہ لینے کا وہی فیصلہ کیا جو ان پڑھ دیہاتی کیا کرتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے کا اُسے موقع تیسرے ہی روز مل گیا۔ اُس نے دُور سے دیکھا کہ لڑکی کا منگیتر گھوڑے پر جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ ملزم نے یہ سمجھنے کی بجائے کہ وہ شکار کے لئے جا رہا ہے، یہ سمجھا کہ منگیتر اُسے کھیتوں میں ڈھونڈنے نکلا ہے اور وہ اسے وہاں کہیں نظر آ گیا تو اسے گولی مار دے گا۔ ملزم کے دماغ میں

منگیتر کا یہ چیلنج سمایا ہُوا تھا کہ کل سورج غروب ہونے سے پہلے اس گاؤں سے نکل جاؤ، ورنہ کسی کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔" کل" کا سورج غروب ہو کر اگلے دن کا سورج طلوع ہو چکا تھا، اس لئے ملزم یہ سمجھا کہ اس کا دشمن اُسے کھیتوں میں دیکھنے نکلا ہے۔ وہ گاؤں میں آکر تو اُسے قتل نہیں کر سکتا تھا۔

ملزم نے گھر سے نہ کلہاڑی لی نہ چھری چاقو لیا، پاگل پن یا اکھڑپن کی کیفیت میں خالی ہاتھوں کھیتوں کو چلا گیا۔ اُس پر دراصل وہی پاگل پن سوار تھا جو قتل یا خودکشی سے پہلے طاری ہُوا کرتا ہے۔ وہ مرنے نہیں بلکہ مارنے جا رہا تھا۔ یہ اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ مارے گا کیسے۔ اگر آپ اس کی اس حرکت کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو صاف پتہ چلے گا کہ اس کے لاشعور میں خودکشی تھی جو بعد میں اس نے گاڑی کے آگے لیٹ کر کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کھیتوں میں گیا تو مقتول اِدھر آنے کی بجائے دُور جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ تب اُسے خیال آیا کہ وہ تو شکار کو یا کہیں اور جا رہا ہے۔ آگے درختوں کی بہتات تھی۔ کہیں کہیں گھاس اُونچی تھی اور اُونچی نیچی ٹیکریاں بھی تھیں۔

منگیتر کی گردن اُنگلیوں کے شکنجے میں

ملزم چھپ چھپ کر مقتول کے پیچھے گیا۔ پھر اُسے بندوق فائر ہونے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ ملزم جنگل میں چلا گیا۔ وہ چھپ چھپ کر مقتول

کو ڈھونڈتا رہا۔ ایک جگہ اُس نے مقتول کا گھوڑا بندھا دیکھا۔ اُس وقت اُسے خیال آیا کہ وہ تو خالی ہاتھ آیا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "دیکھا جائے گا"— اور وہ آگے چلا گیا۔ اچانک قریب ہی گولی فائر ہوئی۔ ملزم بدک گیا۔ اُس نے دیکھا کہ پندرہ بیس گز دور ایک درخت کی اوٹ سے مقتول نے کسی پرندے پر فائر کیا تھا اور آگے آ کر درخت سے گرے ہوئے پرندے کو اُٹھا رہا تھا۔ اُس نے ملزم کو دیکھ لیا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"مقتول نے ملزم سے پوچھا۔

"تم نے کہا تھا کہ گاؤں سے نکل جاؤ"— ملزم نے کہا— "میں گاؤں سے نکل آیا ہوں"— وہ اُس کے قریب چلا گیا۔

"تو جاؤ، دفع ہو جاؤ"— مقتول نے کہا— "کمین ذات کو اونچی حویلی میں رہنے کا کوئی حق نہیں"— مقتول نے ذرا سوچ کر کہا— "کچھ پیسے لے جاؤ۔ یہ نہ کہنا کہ میں نے تمہیں خالی ہاتھ رخصت کیا تھا"

ملزم کو یہ معلوم تھا کہ مقتول کے پاس ایک نالی والی بندوق ہے اور اس کا کارتوس فائر ہو چکا ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر مقتول کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا— "نہ میں گاؤں سے جا رہا ہوں نہ تمہاری بارات ہمارے گاؤں میں آئے گی"

مقتول نے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ ملزم نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا کہ وہ خود اپنی پھرتی پر حیران ہے کہ وہ مقتول کے پہلو کو ہوا اور اُس کی گردن اپنے ہاتھوں میں جکڑ لی۔ اس نے دونوں انگوٹھے مقتول

کی گردن کے صحیح مقام پر نہ رکھے۔ مقتول بہت تڑپا۔ پہلے اُس کے ہاتھ سے بندوق گری، پھر اُس کا جسم ڈھیلا ہُوا اور پھر اُس کا جسم بے جان ہوگیا۔ ملزم نے اُسے چھوڑا تو مقتول گر پڑا۔ ملزم وہاں سے چل پڑا۔ وہ اب دوسری طرف جا رہا تھا۔ میرے کھوجی نے کھرا ٹھیک اُٹھایا تھا۔ جائے واردات تک ملزم کے کھرُے کسی اور سمت سے آتے تھے اور واپس دوسری سمت سے گئے تھے اور یہ کھرُے سیدھے آہنی پھندے میں گئے۔

ملزم کچھ دُور جا کر رکا اور پیچھے دیکھا کہ مقتول اُٹھا تو نہیں۔ وہ نہیں اُٹھا تھا۔ ملزم نے اُدھر ہی دیکھتے پیچھے کو قدم اُٹھائے۔ پھر سیدھا چلنے لگا۔ دوسرا قدم زمین پر رکھا ہی تھا کہ اچانک اس کے پاؤں کے نیچے بڑی زور سے تڑاخ ہوئی اور اس کا دایاں پاؤں پھندے کے نوکدار دانتوں میں جکڑا گیا۔ دندانے اس کے ٹخنے میں اُتر گئے۔ اس نے نیچے دیکھا۔ پھندا گھاس میں چھپا ہُوا تھا۔ گھاس ہرنوں کے لئے رکھی گئی تھی۔ ملزم نے اس قسم کا پھندا دو تین بار دیکھا تھا۔ قریب ہی اسے لمبوترا سا پتھر نظر آیا۔ اس کی مدد سے اس نے پھندے میں سے اپنا پاؤں نکال لیا۔ وہ پھندے کو کھولنا جانتا تھا۔ پاؤں زخمی ہوگیا۔ کچھ پرے جا کر وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا اور اپنی پگڑی پھاڑ کر خون صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے زخموں پر مٹی ڈالی اور پگڑی سے پٹی پھاڑ کر باندھ دی۔

گھر جا کر اُس نے یہ زخم صرف لڑکی کو دکھاتے، اور اُسے بتا دیا کہ اُس کے منگیتر کو وہ ختم کر آیا ہے۔ لڑکی پہلے تو گھبرائی پھر سنبھل گئی اور بولی ـــ "یہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے ....اب دوسرا احسان کرو چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔"

مُلزم نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اب اکیلا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔ لڑکی نے اپنی محبّت کا واسطہ دیا۔ ملزم پر کچھ اثر ہونے لگا۔ جب وہ اپنے آپ میں آیا تو اسے خیال آیا کہ وہ قاتل ہے اور پکڑا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں۔ لڑکی نے بھی اس کی مدد کی۔ مُلزم نے اپنا زخم چھپائے رکھا۔ لڑکی نے اسے کوئی دیسی دوائی اور مرہم دی۔ پھر پولیس کی تفتیش شروع ہو گئی لیکن میں مُلزم کے گاؤں نہیں گیا تھا کیونکہ ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میری تفتیش کے دوران مُلزم اور لڑکی نے گھر سے بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لڑکی نے اسے کہا تھا کہ یہ منگیتر مر گیا تو برادری میں منگیتروں کی کمی نہیں۔ اُس کی شادی کسی صورت میں مُلزم کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے فوراً بھاگ جانا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ ان پر قتل کا شبہ ہو گا اور پولیس ان کا پیچھا کرے گی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مُلزم کا پاؤں ابھی ٹھیک نہیں تھا۔

لڑکی امیر ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ اُس کے لیے بھاگتے وقت رقم ساتھ لے جانا کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا۔

لڑکی گاڑی تلے کٹ مری

ایک مہینہ گزرنے کو آیا تو ان دونوں کو یقین ہو گیا کہ اب پولیس اُن پر شک نہیں کرے گی اور پاؤں بھی پہلے سے بہتر ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے پاؤں کا زخم کامیابی سے چھپائے رکھا تھا۔ لڑکی نے گھر سے بہت سی رقم چُرا کر اپنے پاس رکھ لی۔ زیور رات اس لئے نہ چُرائے کہ جہاں کہیں فروخت کئے پکڑے جائیں گے۔ جذبات میں آ کر گھروں سے بھاگنے والے یہ نہیں سوچا کرتے کہ جائیں گے کہاں اور کریں گے کیا اور رہیں گے کہاں۔ جوان اور خوبصورت لڑکی کو ساتھ لے کر بھاگنا اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ انہوں نے کچھ بھی نہ سوچا اور ایک رات جب گھر والے سو گئے تو پہلے مُلزم باہر نکلا اور گاؤں سے نکل گیا، پھر لڑکی نکلی اور اس سے جا ملی۔ اندھیرے نے انہیں چھپائے رکھا اور وہ ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ مُلزم کو رات کی گاڑی کا وقت معلوم تھا۔

اس نے لڑکی کو اُس طرف کھڑا کیا جدھر انجن رُکتا تھا۔ وہ لڑکی سے پیسے لے کر ٹکٹ لینے گیا۔ اس نے انبالہ کے دو ٹکٹ لیے۔ اتنے میں گاڑی آ گئی۔ یہ چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ گاڑی رُکی اور چل پڑی۔ وہ دوڑتا لڑکی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اُسے بازو سے پکڑ کر دوڑایا۔ لڑکی نے ایک ڈبے کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ گاڑی چلی جا رہی تھی۔ مُلزم اُس کے پیچھے ساتھ لگا کہہ رہا تھا —— "پائیدان

پہ پاؤں رکھو" — اُس نے ابھی پاؤں رکھا ہی تھا اور دوسرا پاؤں ابھی پلیٹ فارم پر تھا کہ پلیٹ فارم ختم ہو گیا۔ لڑکی لٹک گئی پھر گھوم کر ایسی گری کہ گاڑی کے نیچے آ گئی۔

مُلزم بھی گرا لیکن گاڑی سے دُور رہا۔ اُسے لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ دوڑ کر دیکھا۔ لڑکی کی ٹانگیں الگ، بازو الگ اور دھڑ بالکل بے حس الگ پڑا تھا۔ گاڑی رُک گئی۔ پلیٹ فارم کی طرف سے تین چار آدمی دوڑے آ رہے تھے۔ مُلزم وہاں سے کھسک گیا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"میں اس لڑکی کی خاطر گاؤں میں رہا ورنہ بہت عرصہ پہلے بھاگ جاتا" — اس نے ہچکیاں لے لے کے روتے ہوئے کہا — "اسی کی خاطر قتل کیا تھا۔ وہ نہ رہی تو میں وہاں رُک کر کیا کرتا۔ میرا دماغ جواب دے گیا۔ میں روتا ہُوا اُس سمت کو چل پڑا جدھر سے مجھے پولیس پکڑ کر لائی ہے۔ اگر میرا دماغ ٹھکانے رہتا تو میرے پاس انبالہ کا ٹکٹ تھا۔ میں آگے جا کر اسی گاڑی میں سوار ہو جاتا۔ گاڑی رُکی کھڑی تھی، مگر میری ہچکی بندھی ہُوئی تھی اور ہوش اُڑے ہُوئے تھے۔ میں دس سال پہلے کوئٹہ کے ملبے سے نکل کر اور اپنے سارے کنبے کی لاشیں دیکھ کر اسی طرح رویا تھا جس طرح اس لڑکی کی موت پر رویا۔ میں ویرانوں میں روتا پھرا اور یہ ہوش نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں اور کدھر جا رہا ہوں....

"مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ لڑکی کے مرنے کے بعد یہ دوسرا دن تھا یا تیسرا کہ مجھے ریلوے لائن نظر آئی۔ پہاڑیوں میں سے سیاہ دُھواں اُٹھتا

نظر آیا اور انجن کی وسل بھی سنائی دی۔ گاڑی آ رہی تھی۔ مجھے یک لخت سکون محسوس ہونے لگا۔ میں نہایت اطمینان سے ریلوے لائن پر گردن رکھ کر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور مجھے وہ لڑکی نظر آنے لگی جو میری محبت پر مری تھی۔ انجن نے وسلیں دیں لیکن میں نہ اُٹھا۔ میرے دل میں خوف یا افسوس بالکل نہیں تھا۔ میری یہی ایک خواہش تھی کہ مر جاؤں اور میری خواہش پوری ہونے میں ایک دو منٹ رہ گئے تھے مگر ایک آدمی نے مجھے اُٹھایا۔ تب میں نے دیکھا کہ گاڑی میرے قریب رُکی کھڑی ہے۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے پکڑے جانے کا افسوس نہیں، افسوس یہ ہے کہ مرنے کی خواہش پوری نہ ہوئی۔"

قتل کا اقبال کرنے کے باوجود اُس کے مرنے کی خواہش پوری نہ ہوتی۔ اُسے عمر قید دی گئی تھی۔

لقمان حکیم کا نسخہ

لاش کی اطلاع مجھے اُس وقت ملی جب صبح ابھی نیم تاریک تھی۔ مجھے میری بیوی نے جگا کر بتایا تھا کہ کانسٹیبل کہہ گیا ہے کہ ایک ٹھاکر رپٹ درج کرانے آیا ہے۔ اُس کے باغیچے میں ایک عورت کی لاش پڑی ہے جس کا سر کلہاڑی یا ٹوکے سے کھلا ہوا ہے۔

مجھے اُس وقت کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت اچھی طرح یاد ہے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ گھر میں ابھی کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔ گھر میں جو وقت گزرتا ہنستے کھیلتے اور ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کرتے گزرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بیوی جب مجھے کانسٹیبل کا پیغام دے رہی تھی میں نیم بیداری کی حالت میں تھا۔ رات بہت دیر تک تھانے میں کام کرتا رہا اس لیے کانسٹیبل نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میری آنکھ نہ کھلی۔ بیوی جاگ اٹھی اور جا کر کانسٹیبل سے رپورٹ لے لی۔ اُس نے مجھے جگایا اور رپورٹ مجھے دی جو مَیں نے نیم بیداری کی حالت میں

سنی۔ اسی حالت میں مجھے اپنی بیوی کا قہقہہ سنائی دیا اور میں پوری طرح بیدار ہو گیا۔ میری بیوی میرے پلنگ پر بلکہ مجھ پر لوٹ پوٹ ہوتی جا رہی تھی۔

میں ٹھاکر کی رپٹ اور عورت کی لاش کو مذاق سمجھا۔ بیوی نے مجھے جگانے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔ میں ابھی جاگنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ تم گھر میں نکمی رہتی ہو اور میں بیس گھنٹے کام کرتا ہوں۔ مجھے ذرا سو نے دو۔ لیکن اُس نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا — "چاہے دوپہر تک سوتے رہیں، مجھ سے یہ تو سُن لیں کہ میں ہنس کیوں رہی ہوں" —

میں نے پوچھا تو اُس نے کہا — "آپ کی جاگ پوری طرح نہیں کُھلی تھی جب میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ٹھاکر کے باغیچے میں ایک عورت کی لاش پڑی ہے۔ آپ نے خواب میں بڑبڑانے کے لہجے میں پوچھا — لاش زندہ ہے یا مر گئی ہے؟ — میری ہنسی چھوٹ گئی"۔

تو یہ مذاق نہیں تھا۔ میں نے پھر بھی بیوی سے پوچھا — "جھوٹ بک رہی ہو یا واقعی کانسٹیبل آیا تھا؟"

کانسٹیبل واقعی آیا تھا۔ میں تھانیدار تھا۔ قصبے میں تھانیدار بادشاہ ہوتا ہے۔ جب جی چاہے جاگے۔ ڈیوٹی پر جائے نہ جائے۔ میں رات ایک بجے سویا تھا۔ دن کے ایک بجے تک سونے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا لیکن میں اُچھل کر بستر سے نکلا۔ اس فرض شناسی کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کی حکومت تھی جو کوتاہی اور سہل انگاری کی سزا دیتی تھی۔ دوسری

وجہ یہ کہ اس واردات کی تفتیش مجھے ہی کرنی تھی۔ فوراً آ کر تایا دیر سے کرتا تاخیر نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ جائے واردات پر فوراً پہنچنے سے تفتیش آسان ہو جاتی ہے، ورنہ تماشائی کھرا کھوج مٹا دیتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ٹھاکر خود رپورٹ دینے آیا تھا اور لاش اس کے باغیچے میں پڑی تھی۔ قاتل وہ خود ہو سکتا تھا۔ ٹھاکر ہندو زمیندار تھے۔ نوکروں، مزارعوں اور نیچ ذاتوں کے لئے فرعون ہوتے تھے۔ وہ ہمارے سندھی وڈیروں سے ملتے جلتے تھے۔

صبح کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی غسل کر کے نماز پڑھی۔ بیوی ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ میں نے ناشتہ کیا اور چل پڑا۔ دروازے سے نکلا تو مجھے بیوی کی آواز سنائی دی — "اللہ کرے لاش والا زندہ ہو۔"

محنت اور مشقت کرنے والے خاوند کے لئے اچھی اور خوش طبع بیوی ایک ٹانک ہوتی ہے۔ میں اپنی بیوی کی شگفتگی سے تر و تازہ ہو کر تھانے پہنچا۔ نیند پوری نہ ہونے کے باوجود طبیعت میں تازگی آ گئی۔ تھانے میں ٹھاکر میرے دفتر میں بیٹھا تھا۔ اس ہندو زمیندار کی عمر پچپن سال کے لگ بھگ تھی۔ آدھا چہرہ مونچھوں نے چھپا رکھا تھا۔ چہرے سے فرعونیت ٹپک رہی تھی۔ اس کا اتنی سویرے رپورٹ دینے آنا مشکوک سا فعل تھا۔ یہ لوگ رات شراب میں بدمست ہو جاتے اور دوپہر تک سونے کے عادی تھے۔

"ٹھاکر جی کس کی لاش دیکھ آئے تے سویرے سویرے؟"

"میرے نوکروں چاکروں کی عورت تھی"۔ اُس نے جواب دیا —— "باغیچے میں میرا بیٹا ہوتا ہے۔ اپنا ایک مزارعہ کام سے نکلا تو کھیت میں اُسے لاش پڑی نظر آئی"۔ اُس نے میرے بیٹے کو جگا کر بتایا۔ بیٹے نے مجھے آکر بتایا۔ میں شہر میں رہتا ہوں۔ بیٹے کو میں نے باغیچے میں واپس بھیج دیا اور خود آپ کو رپٹ دینے آگیا"۔

میں نے اُس سے وہی چند ایک رسمی سی باتیں پوچھیں جو اس قسم کی رپورٹ درج کرنے سے پہلے پوچھی جاتی ہیں۔ اُس پر کسی شک کا اظہار نہ کیا۔ اُسے بولنے کا پورا موقع دیا۔ اپنے ذہن میں جو سوال محفوظ رکھے ان میں ایک یہ تھا کہ ٹھاکر کا مزارعہ اتنی سویرے کام کو گیا، وہ کام کیا تھا؟ کیا اُس نے اندھیرے میں لاش دیکھ لی تھی؟ ٹھاکر کا بیٹا باغیچے میں ایک مکان میں رہتا ہے۔ اُس نے شہر آکر بوڑھے باپ کو جگایا اور تھانے بھیجا، خود کیوں نہ آیا؟ باپ نے اُسے واپس کیوں بھیج دیا؟ مجھے رپورٹ صبح کی اذان کے ساتھ ملی۔ باغیچہ شہر سے تقریباً پون میل دُور تھا۔ لاش دیکھنے والے نے ٹھاکر کے بیٹے کو جگایا۔ بیٹے نے جا کر لاش دیکھی۔ شہر آیا۔ باپ کو جگایا۔ باپ بیٹے نے اس کے متعلق باتیں کی ہوں گی۔ پھر باپ تھانے آیا۔ اس سارے عمل میں دو نہیں تو ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہُوا ہو گا۔ میرے حساب کے مطابق لاش نصف شب سے کچھ دیر بعد دیکھی گئی یا باپ بیٹے نے یا بیٹے نے مقتولہ کو نصف شب سے کچھ دیر بعد قتل کیا۔ یہ تو میں نے خاص طور پہ

ذہن میں رکھا کہ مرنے والی ٹھاکر کے نوکروں چاکروں کی عورت تھی۔

ان فرعونوں کی نگاہ میں نوکروں اور مزارعوں کی بہو بیٹیوں کی تو کوئی عزت ہی نہیں تھی۔ اِن مظلوموں کو وہ کھانے کے لئے اتنا ہی دیتے تھے جس سے وہ صرف زندہ رہتے تھے۔ انہیں اپنا محتاج بنائے رکھتے تھے۔ ان کی شادیوں پر انہیں قرض دیتے اور اس احسان کے بدلے دلہن کو اپنی دلہن سمجھتے تھے۔ انسانوں کی بجائے وہ مویشیوں کی قدر کرتے تھے کیونکہ مویشی قیمتاً ملتے تھے اور انسان مفت ہاتھ آجاتے تھے۔ ان اَدھ مُوئے انسانوں میں کسی کو جان سے مار دینا ان ٹھاکروں کے لئے کوئی مذموم فعل نہیں تھا۔ مرنے والے کے لواحقین پولیس کو اطلاع دینے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ مجھے یہ سوال پریشان کرنے لگا کہ اپنے نوکروں چاکروں کی عورت کی لاش کو اِس ٹھاکر نے اُس کے لواحقین کے حوالے کر کے جلا دینے کا حکم کیوں نہ دیا؟ رپٹ درج کرانے کیوں آگیا؟

میں نے اُس سے کوئی فالتو بات نہ کی۔ بڑا ہی تجربہ کار کھوجی شہر سے ایک میل دُور گاؤں میں رہتا تھا۔ ٹھاکر کی گھوڑی ایک کانسٹیبل کو دے کر کہا کہ کھوجی کو جتنی جلدی ہو سکے ٹھاکر کے باغیچے میں لے آئے۔ میں اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر ٹھاکر کے ساتھ پیدل جائے واردات کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ٹھاکر مقتولہ کے متعلق ایسی باتیں کرتا گیا جن میں ہمدردی یا افسوس کی بجائے نفرت اور حقارت تھی۔ اُس کے یہ الفاظ مجھے یاد ہیں۔ اُس نے گالی دے کر کہا۔

"اِن لوگوں کی عزت اور آبرو تو کوئی ہوتی نہیں۔ رات چرس اور ٹھرّہ پی کر ایک دوسرے کی عورتوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ کبھی لڑ بھی پڑتے ہیں۔ یہ عورت جس کی لاش ہمارے باغیچے میں پڑی ہے بدمعاش تھی۔ اُس کا خاوند دمے کا مریض ہے۔ اُس بدبخت کو اپنی ہوش نہیں ہوتی۔ دو قدم چلتا ہے تو سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کی بیوی عیش کرتی پھرتی ہے۔ کسی کو اُس نے دھوکہ دیا ہوگا۔ اُس نے کلہاڑی مار کر سر کھول دیا۔ میرا کھیت بھرشٹ (ناپاک) کر دیا۔"

"آپ کو یقین ہے وہ بدکار اور عیاش تھی؟" میں نے پوچھا۔

"غریب مزارعے کا اخلاق ہوتا ہی کہاں ہے داروغہ جی!" اُس نے کہا۔ "میں تو اس کے مرنے کی رپٹ بھی درج نہ کراتا۔ میرا بیٹا کہنے لگا کہ پولیس کو اطلاع کر دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خون کوئی دشمن ہمارے کھاتے میں لکھوا دے۔ آپ چل کر دیکھ لیں۔ لاش اُس کے خاوند کے حوالے کر دیں۔ میں آپ کو اس سے زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ آپ کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے جو اِن ملیچھوں کے جینے مرنے پر ضائع کرتے پھریں۔"

"ہاں بھاٹا کر جی!" میں نے کہا۔ "ملیچھوں کی ایک بدکار عورت ماری گئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

وہ خوش ہو گیا۔ میں نے اُس کے سینے سے اصل بات نکالنے کے لئے دوستانہ باتیں شروع کر دیں۔ تفتیشی جرح کے انداز سے کچھ نہ پوچھا۔

مقتولہ کے متعلق کچھ معلوم کرنے کے لئے کہا۔ "یہ لوگ کالے کلوٹے سے ہوتے ہیں۔ ان کی بیویاں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایسی ہی ہوگی۔ کالی سی اور بدصورت سی"۔

"ارے نہیں داروغہ جی!" اُس نے کہا۔ "یہ مجھے اپنے باپ کی تو لگتی ہی نہیں تھی۔ اُس کا رنگ سانولا نہیں گندمی تھا اور اُس کی صورت اور جسم ایسا کہ اچھے کپڑے پہناؤ تو کوئی نہ کہے کہ یہ کسی مزارعے کی جورو ہے۔ عمر پچیس اور تیتیس کے درمیان تھی۔ صحت ایسی کہ جوانی پھٹی جاتی تھی"۔

اُس نے مرنے والی کے حسن و جوانی کا نقشہ ایسے الفاظ اور ایسے لہجے میں پیش کیا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ مرنے والی پر اُس کی نظرِ کرم تھی۔

"آپ کا بیٹا باغیچے میں ہی رہتا ہے؟"

"وہیں رہتا ہے" اُس نے جواب دیا۔ "بڑا اچھا مکان ہے"۔

"اُس کی عمر کتنی ہوگی"؟

"اس سال چھبیس برس کا ہو جائے گا"۔

"اکیلا رہتا ہے؟"

"اُس کی بیوی اُس کے ساتھ رہتی ہے"۔

لاش میں خون نہیں تھا

ہم جب جائے واردات پر پہنچے تو صبح سپیدہ ہو چکی تھی۔ لاش

بینگنوں کے کیاروں میں پڑی تھی۔ باغیچہ بہت بڑا تھا۔ یہ دراصل سبزیوں کا باغ تھا۔ اس کے اردگرد ٹھاکر کے کھیت تھے۔ باغیچے کے وسط میں ایک مکان تھا جس میں ٹھاکر کا بیٹا رہتا تھا۔ باغیچے سے ملحق مٹی کی دیواروں اور گھاس پھونس کی چھتوں والے چھ سات جھونپڑے تھے جن میں ٹھاکر کے نوکر چاکر اور مزارعے کنبوں سمیت رہتے تھے۔ جہاں لاش پڑی تھی وہاں سے یہ جھونپڑے تقریباً ڈیڑھ سو گز دُور تھے۔

لاش ٹیڑھی سی پڑی تھی۔ اُس علاقے کے مطابق مقتولہ نے گہرے رنگ اور موٹے کپڑے کا گھگھرا پہن رکھا تھا۔ گلے میں جمپر کی طرح چھوٹی سی قمیض تھی۔ اس لباس کے ساتھ عورتیں موٹے کپڑے کا دوپٹہ لیتی تھیں۔ لاش کے ساتھ دوپٹہ نہیں تھا۔ ایک پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ اُس علاقے کے مزدور لوگ اور مزارعے ننگے پاؤں کام کیا کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر آتے جاتے دیسی جوتی پہنتے تھے۔ لاش کے بازوؤں میں چوڑیاں تھیں۔ ان میں پلاسٹک کی بھی تھیں اور کانچ کی بھی۔ نظری معائنے سے پتہ چلا کہ سر میں دو زخم ہیں۔ یہ کلہاڑی کے تھے یا ٹکوے کے۔ کھوپڑی کھل گئی تھی۔ دونوں وار اتنے گہرے تھے اور ایسے لگے تھے کہ مغز بھی زد میں آیا تھا۔ مغز دکھائی دے رہا تھا۔ جسم پر کوئی اور زخم نہیں تھا۔ یہ پوسٹ مارٹم سے معلوم کرنا تھا کہ قتل سے پہلے مقتولہ کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ لاش کا رنگ تمام خون نکل

جانے سے سپید ہو گیا تھا۔ مقتولہ کی عمر تیس سال سے خاصی کم لگتی تھی۔ چہرے پر درد کے آخری تاثرات تھے۔ موت نے درد کا یہ تاثر چہرے پر مستقل کر دیا تھا۔

لاش کے دیگر کوائف یہ تھے کہ ہاتھوں اور بازوؤں پر مٹی تھی۔ کپڑوں پر بھی مٹی تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ مقتولہ کچی مٹی پر تڑپتی رہی ہے۔ مزید گہرے معائنے سے نظر آیا کہ لاش کے ناخنوں میں بھی مٹی پھنسی ہوئی تھی۔

میں نے لاش کی جوتی اتار کر رکھ لی۔ دوسرے پاؤں کی جوتی غائب تھی۔ چوڑیوں کے متعلق مجھے ایک تجربہ ہو چکا تھا۔ میرے اُستاد نے بھی مجھے بتایا تھا کہ عورت کی چوڑیاں نہایت کارآمد چیز ہے اور بہترین کھوج۔ پلاسٹک کی چوڑیاں نہیں ٹوٹتیں، کانچ کی چوڑیاں دھینگا مشتی میں ٹوٹ جاتی ہیں۔ بعض اوقات چوڑی کا ایک ٹکڑا سارا معمہ حل کر دیا کرتا ہے۔ میں نے کانچ کی تین چوڑیاں اس کے بازو سے توڑ کر اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ تین مختلف رنگ تھے۔

جائے واردات پر میں نے خصوصیت یہ دیکھی کہ وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ لاش کے زخموں کے اردگرد، چہرے پر، کپڑوں اور بالوں پر خون جم کر خشک ہو گیا تھا۔ بینگنوں کے پودوں پر (جن پر لاش پڑی تھی) کوئی خون نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے کہیں اور قتل کیا گیا ہے اور لاش یہاں پھینکی گئی ہے۔ کسی نے اسے

اپنے گھر میں قتل کیا ہوگا۔ یعنی موقعہ واردات کہیں دُور تھا۔ اس سے مجھے تفتیش پیچیدہ ہوتی نظر آتی۔ عموماً یہ ہوتا تھا کہ کسی کو قتل کر کے لاش رات کو ریلوے لائن پہ پھینک دی جاتی تھی۔ تیز رفتار ریل گاڑی لاش کے ٹکڑے کرتی گزر جاتی تھی۔ خون کی غیر موجودگی سے یہ پتہ چل جاتا تھا کہ قتل کہیں اور کیا گیا ہے۔ اس واردات میں لاش ٹھاکر کے باغیچے میں پھینکی گئی۔ دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ قاتل ٹھاکر یا اس کا بیٹا ہے اور قتل ان کے گھر میں ہُوا ہے۔ دوسرے یہ کہ قتل کسی اور نے کیا اور ٹھاکر کو مصیبت میں ڈالنے کے لئے لاش اس کے باغیچے میں پھینک دی۔ قاتل مزارعوں اور نوکروں چاکروں میں سے بھی کوئی ہو سکتا تھا۔

یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ قتل کا طریقہ کیا اختیار کیا گیا ہے۔ گلا گھونٹ کر مارنے سے کوئی اور کہانی سامنے آتی ہے۔ زہر دینے کا پس منظر کچھ اور ہوتا ہے۔ کلہاڑی، ٹوکے اور چاقو کا استعمال کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ اس واردات میں کلہاڑی استعمال کی گئی تھی۔ مَیں نے زخم غور سے دیکھے۔ وار پیچھے سے کئے گئے تھے۔ سامنے سے یا دائیں بائیں سے کئے جاتے تو زخموں کے زاویے کچھ اور ہوتے۔ مجھے اس پر بھی غور کرنا تھا کہ وار پیچھے سے کیوں کئے گئے۔

اس واردات میں کھُروں (پاؤں کے نشان) کی شدید ضرورت تھی کیونکہ لاش کہیں اور سے لائی گئی تھی۔ مجھے موقعہ واردات تک پہنچنا تھا۔ جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ یہ بینگنوں کے کیارے تھے۔ اس کے ساتھ

فصل والا کھیت تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ فصل کیا تھی۔ درمیان میں مینڈھ تھی۔ مینڈھ اتنی سخت اور پکّی تھی کہ کوئی کھرا نظر نہیں آتا تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو وہ تماشائیوں نے مٹا دیا تھا۔ کیارے میں اور مینڈھ کے کنارے جو کھرے ملے اُن میں ایک بٹھا کر کے بیٹھے کا تھا، دوسرا اُس آدمی کا جس نے لاش دیکھی تھی اور ان میں ایک کھرا الگ تھلگ تھا۔ جُوتی شہری معلوم ہوتی تھی۔ کھروں کے متعلق میں آپ کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ ہر کوئی کھرا نہیں پہچان سکتا۔ تجربہ کار پولیس افسر بھی بعض کھرے نہیں پہچان سکتے۔ "کھرا اُٹھانا" ایک سائنس ہے۔ پاکستان میں ساہی وال کے دیہاتی علاقے کے اور بہاولپور کے صحرائی علاقے کے کھوجی اس سائنس کے ماہر ہیں۔ یہ لوگ جانگلی اور پسماندہ ہونے کی وجہ سے اہمیت حاصل نہیں کر سکے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس فن میں برطانیہ کا سکاٹ لینڈ یارڈ اور امریکہ کا تفتیشی ادارہ ایف۔ بی۔ آئی ہمارے جانگلی کھوجیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب تو ان کھوجیوں کی اہمیت اور ضرورت اس وجہ سے بھی ختم ہو گئی ہے کہ پولیس کے ہاں سراغرسانی کا رواج نہیں رہا۔ مشتبہ افراد کو تھانے بُلا کر تشدّد میں ڈال دیا جاتا ہے۔ مُخبروں کا سہارا لیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اِن میں سے کوئی اقبال جُرم کر کے مجسٹریٹ کے سامنے دفعہ ۱۶۴ کے تحت اقبالی بیان قلم بند کرا دے۔ سلطانی گواہ بھی بنائے جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عدالت میں مُلزم بھی اور سلطانی گواہ

بھی منحرف ہو جاتے ہیں اور کہیں چوپٹ ہو جاتا ہے۔

خاوند مریض، بیوی حسین

میں نے جس کھوجی کو بُلایا تھا وہ آگیا۔ اُس نے لاش کے اردگرد زمین دیکھی۔ بینگنوں کے پودوں کے ٹوٹے ہوئے پتے دیکھے۔ مینڈھ کا کنارہ دیکھا۔ اُس نے تین چار پتے توڑ لیے یا ٹوٹے ہوئے پتے اُٹھا لیے۔ بینگن کا پتا چوڑا اور لمبا ہوتا ہے۔ اِن پتوں پر مٹی کے کچھ نشان تھے۔

کھوجی نے مینڈھ کے کنارے پر ایک کھُرا مجھے دکھایا اور کہا — "یہ ہے آپ کا ملزم" — اُس نے مینڈھ کے کنارے کے دو اور کھُرے مجھے دکھا کر کہا — "اس پر لاش کا وزن ہے۔ یہ دیکھیں۔ لاش پھینک کر جا رہا ہے۔ اس پر کوئی وزن نہیں۔"

میں ابھی اتنا زیادہ تجربہ کار نہیں ہُوا تھا۔ مجھے دونوں کھُروں میں کوئی فرق نظر نہ آیا کیونکہ میری آنکھ کھوجی کی آنکھ نہیں تھی۔ اُس نے پتے دکھا کر کہا — "یہ بھی آپ کا ملزم ہے۔ آپ چاہیں تو زمین والے کھُرے کا مولڈ بنوا لیں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کھُرا صاف ہے۔ سو میل دُور دس سال بعد بھی پہچان لوں گا۔"

"پھر اُٹھاؤ کھُرا" — میں نے کہا — کھُرا اُٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ زمین دیکھتے دیکھتے ہی کھُرا تلاش کرو اور موقعۂ واردات تک پہنچو۔

یہی اصل کام تھا۔

کھوجی زمین سے بھید لینے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اپنی کاغذی اور دیگر کارروائی شروع کر دی۔ لاش پوسٹمارٹم کے لئے بھجوا دی۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا جس میں سرکاری ہسپتال اور ایک ڈاکٹر تھا۔ عام قسم کا پوسٹمارٹم وہیں ہو جاتا تھا، دیگر ٹیسٹوں کے لئے دُور جانا پڑتا تھا۔ میرے قصبے کا ڈاکٹر ہندو تھا اور صحیح معنوں میں ڈاکٹر۔ ذرّہ بھر متعصب نہیں تھا۔

میں نے ایک آدمی کو اس پیغام کے ساتھ تھانے کو دوڑا دیا کہ چار کانسٹیبلوں کو فوراً بلا لائے۔ ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ تھا۔ اُسے کہا کہ باغیچے کے جس مکان میں ٹھاکر کا بیٹا رہتا ہے اُس کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو جائے۔ کسی کو اندر نہ جانے دے یا باہر نہ آنے دے۔ دو کانسٹیبل میرے ساتھ تھے۔ انہیں کہا کہ مزارعوں کے جھونپڑوں میں جا کر ہر کسی کو باہر نکال دیں اور وہاں کھڑے رہیں۔ میں نے ایک مریل سے آدمی کو دیکھا۔ کچھ دُور بیٹھا رو رہا تھا۔ اُس کا دم اُکھڑا ہوا تھا۔ سانس بڑی ہی مشکل سے لے رہا تھا۔ وہ مقتولہ کا خاوند تھا۔ اُسے اپنے پاس بلایا۔ آہستہ آہستہ چلتا آیا۔ اُس کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ میں نے اپنے بیٹھنے کا انتظام باغیچے کے اندر کرایا۔ مقتولہ کے خاوند کو وہاں لے گیا اور اُسے پاس بٹھا کر تسلی دلاسہ دیا۔

"کچھ بتا سکتے ہو تمہاری بیوی کو کس نے قتل کیا ہے؟" — میں نے اُس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں حضور!"۔ اُس نے روتے ہوئے جواب دیا۔ دمہ اُسے بولنے نہیں دے رہا تھا۔۔۔ "میرا تو کوئی دشمن نہیں، مرنے والی کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی تو مجھے معلوم نہیں۔"

میں اس آدمی کو اس نظر سے دیکھ رہا تھا کہ ٹھاکر کے کہنے کے مطابق مقتولہ خوبصورت اور جوان تھی اور اُس کا چال چلن بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اُس کے خاوند کو اس بُری حالت میں دیکھ کر مجھے یقین سا ہونے لگا کہ اس خالم مرض کے مریض کی بیوی کا چال چلن خراب ہوگا۔ لہٰذا یہ شک بھی بے جا نہ تھا کہ خاوند نے بیوی کو قتل کر دیا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس آدمی کے بازوؤں اور جسم میں اتنی جان ہے یا نہیں کہ کلہاڑی کا اتنا سخت وار کر سکے کہ کھوپڑی کھول دے۔ یہ پیشِ نظر رکھیں کہ انسانی کھوپڑی بڑی ہی سخت ہوتی ہے۔ کلہاڑی کھوپڑی توڑ سکتی ہے لیکن جتنے گہرے وار مقتولہ کی کھوپڑی پر کئے گئے تھے وہ اس مریل آدمی کے نہیں ہو سکتے تھے۔ کلہاڑی مغز تک اُتر گئی تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ کھوپڑی میں اتنی گہری اُتری ہوئی کلہاڑی نکالنے کے لئے اس سے زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جس طاقت سے وار کیا جاتا ہے۔ یہ خاوند تو کلہاڑی کا بوجھ اُٹھانے کے بھی قابل نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے شک میں رکھا کیونکہ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنے کسی دوست سے یا کسی کو اُجرت دے کر بیوی کو قتل کرایا ہو۔

"دمے کا مرض کب سے شروع ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شادی کے دوسرے سال" ۔ اُس نے جواب دیا ۔ "اس سے پہلے تو میں بالکل ٹھیک تھا۔ چھ سال ہو گئے ہیں علاج کراتے۔"

"کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ اس حالت میں بھی بیوی تمہاری وفادار تھی؟"

"جی حضور!" ۔ اُس نے جواب دیا ۔ "میں سولہ آنے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس نے مجھے دھوکہ نہیں دیا ... ہم بہت دُور کے رہنے والے ہیں۔ نہ اس کے ماں باپ کو معلوم ہے کہ ہم کہاں ہیں نہ میرے ماں باپ کو معلوم ہے۔ یہ میرے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔ ماں باپ اس کی شادی جس کے ساتھ کر رہے تھے وہ آسودہ حال گھر کا لڑکا تھا لیکن اس کا دل میرے ساتھ تھا۔ آپ نے محبت کے بہت قصے سُنے ہوں گے، ہماری محبت جیسا قصّہ کوئی نہیں سُنا ہو گا۔"

میں اُس کی محبت کا قصّہ سُننے کے مُوڈ میں نہیں تھا لیکن میں اُس کے جذبات کو مجروح بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جذباتی انداز سے بول رہا تھا۔ اپنے وقت کو یاد کر رہا تھا۔ اُسے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ ایک تھانیدار کے ساتھ باتیں کر رہا ہے جس کے دل میں اُس کے خلاف قتل کا شبہ ہے۔ وہ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ اُس کی بیوی نے بیماری میں اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اُس کا علاج کراتی رہی ہے۔ وہ خود کام کاج کے قابل نہیں رہا تھا۔ مقتولہ باغیچے میں ٹھاکر کے بیٹے کے گھر کام کرتی اور خاوند کا علاج کراتی تھی۔ وہ کسی حکیم سے دوائی لاتی تھی۔

میرے ذہن میں دو باتیں آرہی تھیں۔ ایک یہ کہ اس قسم کے خاوند عموماً بیویوں کے ہاتھوں قتل ہوا کرتے ہیں۔ اگر مقتولہ اتنی دلیر تھی کہ اس آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی تھی اور ٹھاکر کی رائے کے مطابق اب بدکار تھی تو اس کے ہاتھوں اس خاوند کو قتل ہونا چاہیئے تھا۔ ایسی بیویاں اس قسم کے خاوندوں کو زہر دے دیا کرتی ہیں۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ خاوند بیماری سے مرا ہے۔ یہ خاوند تو ذرا سے دھکے کا منتظر تھا، مگر وہ کہہ رہا تھا کہ بیوی اس کا علاج کراتی تھی۔ دوسری بات میرے ذہن میں یہ آئی کہ بیوی اسے اوٹ پٹانگ دوائیاں دے کر اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی اور باہر اپنے کھیل کھیلتی رہی ہے۔ میں بال کی کھال اتار لینے کی کوشش کرنے لگا۔

"وہ کیسی تھی" — میں نے پوچھا — "ہوشیار تھی؟ چالاک تھی؟ سیدھی سادی تھی؟"

"ہوشیار تو بہت تھی" — اس نے جواب دیا — "ایسی سیدھی بھی نہیں تھی کہ کسی کے جال میں آجاتی۔"

"میں نے مان لیا کہ تمہیں دوائی لاکے دیتی تھی" — میں نے کہا — "ذرا توجہ سے یاد کرو اور مجھے بتاؤ کہ گھر میں خوش رہتی تھی یا تمہاری بیماری کی وجہ سے پریشان اور بجھی بجھی رہتی تھی"

"وہ جی ہنسنے کھیلنے والی لڑکی تھی" — اس نے جواب دیا — "خوش رہتی تھی۔ میں اپنی بیماری سے تنگ آکر کبھی کبھی رو پڑتا تھا تو مجھے حوصلہ

دیا کرتی تھی۔ ۔ وہ دل گردے والی تھی۔"

"ایک ہی حکیم سے دوائی لاتی رہی ہے؟"

"نہ جی!" اُس نے جواب دیا۔ "بہت سیانے آزماتے ہیں۔ ڈاکٹر (سرکاری ہسپتال والے) سے بھی دوائی لیتے رہے ہیں۔ اب کوئی تین مہینوں سے اُس حکیم کا علاج چل رہا ہے۔ بیوی مجھے اُس کے پاس لے گئی تھی۔"

"اس کی دوائی سے آرام نہیں آیا؟"

"پورا آرام تو نہیں آیا" اُس نے جواب دیا۔ "دوائی کا اثر اچھا ہے۔ اس حکیم پر میرا یقین بیٹھ گیا ہے۔"

خاوند کو افیم کھلا کر چلی گئی

اس کا مطلب یہ تھا کہ بیوی اس کا علاج سنجیدگی سے کرا رہی تھی۔ میں اس آدمی کی زبان سے یہ سُننا چاہتا تھا کہ دوائی کا کچھ فائدہ نہیں ہُوا بلکہ حالت روز بروز بگڑتی جا رہی ہے ... میں نے بہت سے سوال کرکے اپنا ذہن صاف کر لیا پھر میں سیدھی باتوں پر آ گیا۔

"تمہاری بیوی اچھی شکل وصورت والی تھی" ... میں نے کہا۔ "سب جانتے تھے کہ تم بیمار ہو اور اپنی بیوی کے لئے مصیبت بنے ہوتے ہو۔ بعض بدمعاش آدمی ایسی بیویوں کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

کیا تمہیں کبھی پتہ چلا تھا کہ ایسا کوئی آدمی تمہاری بیوی پہ بُری نظر رکھتا ہے اور اُس کے پیچھے پڑا ہُوا ہے؟"

"ہمارے ہاں کوئی بات چھُپی نہیں رہتی" — اُس نے جواب دیا — "جس کسی کو کسی کے بارے میں کوئی بات سُنائی دے وہ اُس تک ضرور پہنچاتی جاتی ہے۔ اگر میری بیوی کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات مشہور ہوتی تو میرے کانوں میں ضرور پڑتی" — اُس نے آہ بھر کر کہا — "ہم بہت غریب لوگ ہیں حضور! ہماری عزت انہی کے ہاتھوں میں ہے جن کا ہم دیا کھاتے ہیں۔ ہم ان کے بھکاری ہیں۔ ان کے آگے دم نہیں مار سکتے۔ ٹھاکر کا بیٹا اچھا آدمی نہیں۔ میری بیوی نے دو تین بار مجھے بتایا تھا کہ وہ اسے فالتو پیسے دیتا رہتا ہے اور اس کا دل صاف نہیں۔ میری بیوی نے یہ بھی کہا تھا کہ تجھے تمہارے لئے دوائیوں کی ضرورت ہے اور دوائیوں کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے اس لئے میں چھوٹے ٹھاکر کو انگلیوں پہ نچا رہی ہوں۔ اگر تمہارے کانوں میں کوئی اُلٹی سیدھی بات پڑے تو اعتبار نہ کرنا۔ میں اتنی جلدی کسی کو عزت دینے والی نہیں"۔"

"تم نے اعتبار کر لیا تھا؟"

"اعتبار نہ کرتا تو کسی کا کیا بگاڑ لیتا حضور!" — اُس نے کہا — "بیماری نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ کسی کے مُنہ آ سکتا یا اپنی بیوی کو اپنی مرضی کرنے سے روک سکتا۔ میں بیوی کا محتاج تھا۔"

"کل رات وہ کس وقت گھر سے نکلی تھی؟"

"میرے سو جانے تک وہ گھر میں تھی"۔ اُس نے جواب دیا۔ "ایک آدمی نے صبح جگایا اور بتایا کہ تمہاری بیوی کی لاش کھیت میں پڑی ہے"۔

"شام کو وہ تمہیں خوش نظر آتی تھی؟"

"روزمرہ کی طرح تھی"۔ اُس نے جواب دیا۔

"اس تکلیف میں تمہیں اتنی گہری نیند آجاتی ہے کہ صبح تک تمہیں ہوش ہی نہیں آتی؟"

"کبھی کبھی بیوی مجھے ایک گولی دیا کرتی تھی جس سے ساری رات بے ہوشی کی نیند سو یا رہتا تھا"۔ اُس نے جواب دیا۔ "کل شام بھی اس نے مجھے وہ گولی دی تھی"۔

"یہ گولی کبھی کبھی دیتی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "ہر رات نہیں دیتی تھی؟"

"نہیں"۔ اُس نے جواب دیا۔ "کہتی تھی کہ یہ گولی ہر رات نہیں لینی چاہیے"۔

اس سے مجھے شبہ ہوا کہ مقتولہ خاوند کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی ہے۔ جس رات اُسے باہر نکلنا ہوتا تھا اُس رات اسے نیند کی گولی کھلا دیتی تھی۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہ گولیاں اُسے حکیم نے دی تھیں اور یہ افیم کی گولیاں تھیں.... بہرحال اس آدمی سے میں نے یہ حاصل کیا کہ

اسے اپنی بیماری کی معذوری کی وجہ سے اپنی بیوی پر کُلی اعتماد تھا۔ لہٰذا اس پر قتل کا شک بے بنیاد تھا۔ اُس کی جسمانی حالت بھی ایسی تھی کہ وہ بیوی کو اس طریقے سے قتل نہیں کر سکتا تھا جس طرح وہ قتل ہوئی تھی۔ یہ پتہ چل گیا تھا کہ ٹھاکر کا بیٹا مقتولہ کو پھانسنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس سے مجھے یہ خیال آیا کہ مقتولہ نے اُسے مایوس کیا ہو گا۔ اس سے پیسے لیتی رہی اور دوستی کسی اور سے لگا لی۔ ٹھاکر کے بیٹے نے فرعونیت کا مظاہرہ کیا اور اسے قتل کرا دیا.... مگر لاش اپنے ہی باپ کے غیصے میں کیوں پھینکی؟ اسے قتل کہاں کیا؟ اپنے گھر میں کیا ہو گا!

تھانے سے چار کانسٹیبل آ چکے تھے۔ میں نے تمام کانسٹیبلوں اور ہیڈ کانسٹیبل کو ہدایت دی کہ مزارعوں اور نوکروں کے جھونپڑوں کے اندر جا کر اچھی طرح تلاشی لیں۔ اندر اور باہر بھی زمین دیکھیں جہاں جہاں سے کلہاڑی یا ٹوکہ ملے وہ لے آئیں۔ خون دیکھیں۔ ٹوٹی ہوئی چوڑی کا کوئی ٹکڑا دیکھیں۔ ایک پاؤں کی جوتی دیکھیں اور قتل کا کوئی کھوج تلاش کریں۔ میں نے انہیں واردات کے متعلق ضروری کوائف اور اپنے شکوک بتا دیئے تھے۔ انہیں روانہ کر کے میں نے ٹھاکر اور اُس کے بیٹے سے کہا کہ میں اُن کے مکان کے اندر جانا چاہتا ہوں۔ بڑا ٹھاکر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں نے کفر بک دیا ہو۔ پولیس کا اُس کے گھر داخل ہونے کا مطلب خانہ تلاشی تھا، اور خانہ تلاشی ملزموں کی کی جاتی ہے۔

"داروغہ حضور!" بڑے ٹھاکر نے کہا — "ایسی تو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ آپ اندر چلیں۔ ہمارے مہمان بن کے بیٹھیں لیکن ہمارے مزارعہ کی بیوی کے قتل میں ہمارے گھر کی تلاشی؟ اس سے بڑھ کر اور بے عزتی کیا ہو گی۔"

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں مزارعوں وغیرہ کے گھروں کی بھی تلاشی لے رہا ہوں" — میں نے کہا — "مجھے آپ کے گھر کی بھی تلاشی لینی ہے۔ میں صرف ایک نظر اندر دیکھوں گا۔ سامان نہیں کھولوں گا۔"

"آپ ہمیں ہمارے مزارعوں کی قطار میں کھڑا کر رہے ہیں" — ٹھاکر نے کہا۔

"ٹھاکر صاحب!" — میں نے اس کے قریب ہو کر دھیمی سی آواز میں کہا — "میں آپ کے گھر میں جا رہا ہوں۔ میں اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"لو لے کیا لیتے ہیں" — اس نے کہا — "آپ جو مانگیں گے نقد حاضر کروں گا۔ مکان کے اندر نہ جائیں۔"

مکان کا دروازہ دور نہیں تھا۔ میں اس طرف چل پڑا۔ اس نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی۔ میں نے دروازے کو ٹھڈا مارا اور اندر چلا گیا۔ مجھے ایک جوان لڑکی نظر آئی۔ اس نے مجھے دیکھا اور گھونگھٹ کر کے ایک طرف ہو گئی۔ میں نے اس کے لباس سے جان لیا کہ یہ بڑے ٹھاکر کی بہو ہے۔ رنگ سانولا اور نقش و نگار میں کوئی کشش نہیں تھی۔

اس کی نسبت مقتولہ خوبصورت تھی مگر اُس کی قسمت اس لیے بُری تھی کہ وہ غریبوں کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ باپ بیٹا میرے پیچھے اندر آ گئے۔ میں نے صحن میں بکھرے ہوئے سامان، لکڑیوں کے ڈھیر اور غسل خانے کو اچھی طرح دیکھا۔ دو کمرے تھے۔ دونوں میں گیا۔ پلنگوں کے نیچے دیکھا۔ ٹرنکوں کے پیچھے دیکھا اور کوئی ایسی جگہ نہ چھوڑی جہاں کچھ چھپایا جا سکتا تھا۔ کچھ نہ ملا۔

مقتولہ اتنی کچی نہیں تھی

باہر آیا تو کانسٹیبل جھونپڑوں کی تلاشی لے آئے تھے انہوں نے تین چار کلہاڑیاں اور اتنے ہی لڑکے برآمد کئے تھے۔ میں نے ہر ایک کو غور سے دیکھا سونگھا۔ آلۂ قتل انہی میں ہو سکتا تھا لیکن مجھے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ میں نے یہ تمام ہتھیار رکھ لئے۔ ہر ایک کے ساتھ اُس آدمی کے نام کی پرچی لگا دی جس کے گھر سے ہتھیار برآمد ہُوا تھا۔ یہ سب مجھے معائنے کے لئے بھیجنے تھے۔

"داروغہ صاحب!"۔ بڑے ٹھاکر نے مجھے بے چین ہو کر کہا۔ "ان (مزارعوں) ملیچھوں کے ہاں تو یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ انہیں ہم جانتے ہیں، آپ نہیں جانتے۔ ان سب کو بٹھا کر دھمکی دیں۔ سالوں کو اُلٹا لٹکائیں۔ قاتل آپ کے سامنے آ جائے گا۔ مجھے اجازت دیں۔ میں مُلزم پکڑ دیتا ہُوں۔"

"پھر میرے پاس آپ کیوں دوڑے آتے تھے؟" میں نے کہا۔
"قاتل کو پکڑ کر ساتھ لے آتے۔"

میں نے ٹھاکر کے بیٹے کو الگ بٹھا لیا اور اس کے باپ کو دور بیٹھنے کو کہا۔ بیٹا اچھا جوان تھا۔

"مقتولہ تمہارے گھر میں کام کرتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ تر باغیچے میں کام کرتی تھی" اس نے جواب دیا۔ "کبھی کبھی گھر میں بھی اُسے کسی کام پر لگا لیا جاتا تھا۔"

"اس کا چال چلن کیسا تھا؟"

"اچھا نہیں تھا۔"

"تم نے کس طرح جانا کہ اچھا نہیں تھا؟" میں نے کہا۔ "جس کسی کے ساتھ اس کا دوستانہ تھا اُس کا نام لو۔"

"میں کسی کا نام تو نہیں لے سکتا" اس نے پریشان سا ہو کر کہا۔ "وہ کچھ ایسی ہی تھی۔"

"میں پوچھتا ہوں تم کس طرح کہہ رہے ہو کہ اس کا چلن اچھا نہیں تھا" میں نے پوچھا۔ "تم نے اُسے آزمایا تھا؟"

"نہ جی!" اس نے جواب دیا۔ "ہم ان لوگوں سے مُنہ نہیں لگاتے۔"

"سُنو میرے دوست!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تمہارا اگر یہ خیال ہے کہ مرنے والی غریب مزارعہ کی بیوی تھی اور میں تفتیش میں کوئی دلچسپی نہیں لوں گا تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میری

نظر میں مقتولہ انسان کی بچی تھی۔ میں قاتل کو پکڑ کر دم لوں گا۔ مجھے پریشان کرو گے تو ساری عمر پچھتاؤ گے۔ ہو سکتا ہے پچھتانے کے لئے زندہ نہ رہ سکو۔ اگر اُسے تم نے مارا یا مروا دیا ہے تو میرے کان میں کہہ دو کہ یہ تمہارا کام ہے۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ اگر میں نے تفتیش کر کے پکڑا تو اپنا انجام سوچ لو۔"

اُس نے انکار کیا۔ قسمیں کھانے لگا۔

"اُس کے ساتھ تمہارے تعلقات قابلِ اعتراض تھے"—— میں نے کہا۔

"یہ بالکل غلط ہے"——اُس نے جواب دیا۔

"یہ نہ کہو کہ یہ بالکل غلط ہے۔ یوں کہو کہ وہ ابھی تمہارے جال میں نہیں آئی تھی"——میں نے کہا——"تم اُسے فالتو پیسے دیتے تھے۔ وہ اپنے خاوند کے لئے دوائی لاتی تھی"——میں نے اپنے قیافے کے مطابق کہا—— "وہ جہاں کام کرتی تھی تم وہاں اس کے گرد منڈلانے لگتے تھے۔ تم اُسے گھر کے کام پر لگاتے تھے مگر بیوی کی موجودگی میں تم اپنی خواہش پوری نہیں کر سکتے تھے"——وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ میں نے کہا——"تم نے محسوس کیا کہ وہ تمہیں انگلیوں پر نچا رہی ہے اور تمہارے پیسے کھائے جا رہی ہے۔ تم نے اُسے قتل کرا دیا۔"

اُس نے تڑپ تڑپ کر اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ قتل کے ساتھ اُس

کا کوئی تعلق نہیں۔ میری مزید جرح کے بعد اُس نے تسلیم کر لیا کہ مقتولہ پہ اُس کی نظر تھی اور اسی نیت سے اُسے پیسے دیتا تھا۔ میں نے اُس پہ اور زیادہ دباؤ ڈالا، سوال در سوال کے چکر دیتے تو اُس نے بتایا کہ وہ مقتولہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا اور مقتولہ اُسے وعدوں پہ ٹالتی رہتی اور بار بار کہتی تھی کہ اُسے اپنے خاوند کے علاج کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ اُسے دیتا رہتا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے خاوند کی صحت کے متعلق وہ بہت پریشان رہتی تھی"۔۔۔ میں نے کہا۔

"بہت زیادہ داروغہ جی!" اُس نے کہا ۔۔۔ "میں نے ایک روز اُسے کہا کہ کیوں اس آدمی پہ پیسہ تباہ کر رہی ہو۔ وہ آدھا مر چکا ہے۔ مرنے دو اسے۔ تمہیں تو ایک سے ایک اچھا خاوند مل سکتا ہے۔ اُس نے کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کہا ۔۔۔ نہ ٹھاکر جی! ایسی بات مُنہ سے نہ نکالیں۔ میں تو خاوند کو اپنی زندگی دینے کو تیار ہوں، ۔۔۔ اِن لوگوں کی عورتوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی نہ کوئی اخلاق ہوتا ہے۔ ہم جسے اشارہ کر دیں وہ ہمارے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے لیکن یہ عورت معلوم نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کو پُوجتی تھی۔ بعض اوقات رو کر مجھ سے پیسے لیتی تھی"۔

مختصر یہ کہ چھوٹے ٹھاکر کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مقتولہ کوئی ایسی آوارہ نہیں تھی جیسا اس کلاس کی عورتوں کو سمجھا جاتا تھا، اور یہ

بھی کہ اپنے خاوند کے ساتھ اسے بہت محبت بھی اور وہ اُس کے علاج کے لئے پریشان رہتی تھی۔ چھوٹے بھائی کو میں نے مزید کریدا تو اُس نے مزارعوں میں سے ایک آدمی کا نام لیا اور کہا۔ "اس آدمی کے ساتھ مقتولہ کے گھر سے مراسم تھے اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ساتھ مقتولہ کا غلط قسم کا دوستانہ تھا، اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مقتولہ نے اس آدمی کو دھوکہ دیا ہوگا۔ یہ آدمی بدمعاش ہے۔ جُرم کرنے سے نہیں ڈرتا۔ اُس نے مقتولہ کو قتل کر کے لاش یہاں پھینک دی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بدمعاش نے مقتولہ سے کہا ہو کہ وہ خاوند کو مر نے دے اور اُس کے ساتھ شادی کر لے یا اُس کے ساتھ بھاگ چلے۔ مقتولہ کشش والی عورت تھی۔ چالاک بھی تھی اور دلیر بھی۔ اُس میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ہنس مُکھ تھی۔ کبھی کبھی خاوند کے لئے روتی تھی، ورنہ وہ تو ایسی تھی کہ روتوں کو ہنسا دیتی تھی۔"

"تم نے ایسا بدمعاش مزارعہ کیوں رکھا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اپنی ضرورت کے تحت" اُس نے جواب دیا۔ "اتنے سارے مزارعوں اور نوکروں کو ہم خود تو نہیں سنبھال سکتے۔ ایک دو بدمعاش ہوں تو انہیں اونچی بات نہیں کرنے دیتے۔ یوں سمجھیں کہ ہم نے اس بدمعاش کو پال رکھا ہے۔ یہ شخص جوان ہے۔ ابھی تک اُس نے شادی نہیں کی۔ کوئی کام نہیں کرتا لیکن اُجرت سب سے زیادہ لیتا ہے۔"

غریب عورت، بدمعاش مزارعہ

میں نے ٹھاکر کو فارغ کر دیا لیکن یہ تفتیش کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ میں ابھی ہر ایک مشتبہ کا ذائقہ چکھ رہا تھا۔ میں نے اس بدمعاش مزارعہ سے پہلے مقتولہ کی ہمراز سہیلی کی تلاش ضروری سمجھی۔ عورتوں سے پوچھا تو دو جوان لڑکیاں سامنے آگئیں۔ وہ واقعی اُس کی ہمراز تھیں۔ بہت سے سوالوں اور جوابوں سے میں نے یہ معلومات حاصل کیں کہ مقتولہ چالاک اور ہوشیار تھی۔ اپنے خاوند کی صحت کے لئے وہ بہت پریشان رہتی تھی اور کہتی تھی کہ اسے وہ تندرست کر کے دم لے گی۔ چھوٹے ٹھاکر کے متعلق اکثر ان دونوں سہیلیوں کو وہ بتاتی رہتی تھی کہ اُسے پھانسنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا اور مقتولہ اُسے انگلیوں پر نچاتی رہتی تھی۔ اُس سے پیسے لے آتی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر کے متعلق اُنہوں نے بتایا کہ بدھو سا آدمی ہے۔ اس کی بیوی میں کوئی کشش نہیں۔ وہ مزارعوں اور نوکروں کی بہو بیٹیوں کے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ مقتولہ چونکہ سب سے زیادہ خوبصورت تھی، اس لئے اس کی توجہ اُسی پر مرکوز تھی۔

ان لڑکیوں نے بدمعاش مزارعے کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ مقتولہ اس آدمی کی تعریفیں کیا کرتی تھی اور وہ مقتولہ میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ مقتولہ نے انہیں کبھی بتایا نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے

ہیں۔ ان لڑکیوں کو شک تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

"کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ مقتولہ نے اس آدمی کے ساتھ دھوکہ کر کے کسی اور کے ساتھ دوستی لگالی ہو اور اس آدمی نے مقتولہ کو قتل کر دیا ہو؟" — میں نے پوچھا۔

ان لڑکیوں نے بتایا کہ یہ آدمی ٹھاکر کا پالا ہوا بدمعاش ہے۔ وہ قتل کر سکتا ہے لیکن مقتولہ نے شاید کسی اور کے ساتھ دوستی نہیں لگائی۔ ایک لڑکی نے کہا — "وہ (مقتولہ) شہر بھی جاتی تھی۔ حکیم سے دوائی لینے بھی جاتی تھی۔ وہاں اس کا کہیں دل لگ گیا ہو گا جو اس نے ہمیں نہیں بتایا۔"

میں نے اور کچھ اخذ کیا یا نہیں، میں نے یہ سوچا کہ مقتولہ کی طرح کوئی خوبصورت بیوی مجبور اور محتاج ہو جاتی ہے تو اُسے مدد دینے والے تو بہت ہوتے ہیں لیکن اُس سے ہر کوئی مدد کی قیمت وصول کرتا ہے۔ ہر کوئی اُس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر اُسے کھلونا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مقتولہ کی غربت، خاوند کی بیماری اور اُس کی شکل وصورت اُس کی کمزوریاں بن گئی تھیں۔ سب یہ سمجھتے تھے کہ غریب کی تو عزت ہی نہیں ہوتی۔ یہ عورت اسی چکر میں کسی کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور لاش اس لئے ٹھاکر کے باغیچے میں پھینکی گئی کہ قتل کا شبہ ٹھاکر یا مزارعوں پہ ہو۔ قاتل نے یہ نہیں سوچا کہ خون کی غیر موجودگی راز فاش کر دے گی۔ یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میں نے ٹھاکر اور اس کے بیٹے

کو مشتبہ فہرست میں رکھا۔

میرے پاس ابھی بہت وقت تھا۔ میں نے رات تک وہیں پوچھ گچھ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کھوجی ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ مجھے امید بھی کہ وہ کہیں نہ کہیں کھُرا جا نکالے گا۔ اس سے میرا کام آسان بھی ہو سکتا تھا اور مشکل بھی۔ اگر مقتولہ باغیچے سے میل دو میل دُور قتل ہوئی ہے تو مشتبہ افراد میں تبدیلی اور اضافہ لازمی تھا..... میں نے بدمعاش مزارعے کو بُلایا۔ وہ ہٹا کٹا جوان تھا۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ جسم کے لحاظ سے وہ پالا ہُوا سانڈ لگتا تھا۔ اُس کا چہرہ بتاتا تھا کہ یہ مزارعہ اَن پڑھ ہو سکتا ہے احمق نہیں ہو سکتا اور یہ چالاک بھی ہے۔ اُس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ وہ فدویوں کی طرح جھکا نہیں۔ اُس کے انداز میں غلامی نہیں تھی جو اِن لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ میں جان گیا کہ اس آدمی کے ساتھ مجھے ہوشیار ہو کر بات کرنی پڑے گی۔

"مقتولہ کا چال چلن کیسا تھا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"اچھا تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"میں تم سے یہ اُمید رکھوں گا کہ تم جھوٹ نہیں بولو گے" — میں نے کہا — "ایک عورت قتل ہو گئی ہے۔ مجھے قاتل کو پکڑنا ہے۔ تمہاری مدد کے بغیر میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"آپ کو شاید یہ جھوٹ لگا ہے کہ میں نے مقتولہ کا چال چلن اچھا بتایا ہے" — اُس نے کہا — "آپ بھی اِن ٹھاکروں، ساہوکاروں اور

پنڈتوں کی طرح یہی کہتے ہوں گے کہ ہم جیسے لوگوں کا چال چلن ہوتا ہی کوئی نہیں۔ ہم مزدور اور محتاج ہیں۔ آپ ہمارے مُنہ پر ہر طرح کی کالک مل سکتے ہیں۔"

آدمی عقل والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے بولنے کے انداز میں جان تھی۔ میں نے اُسے ٹوکا نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا — "جس عورت کے خاوند کو بیماری معذور کر دے اور عورت کو اس خاوند سے اتنی محبت ہو کہ اُس کے لئے اپنا خون بھی قربان کرتی پھرے وہ ہر اُس آدمی کی جورُو بن جاتی ہے جس کے آگے وہ دو چار پیسوں کے لئے ہاتھ پھیلاتی ہے۔ اور اگر عورت ٹھاکروں کی مزدور یا مزارعہ ہو تو اُس کی عزت کو بلا خوف خرید لینا بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ عورت ایسی ہی مجبور تھی کہ خاوند کے علاج کے لئے بھیک مانگتی پھرتی تھی اور جو اُسے بھیک دیتا تھا وہ اُس کی عزت کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔"

"کون کون اس کی عزت کے ساتھ کھیلا؟" — میں نے پوچھا۔

"کوشش کرنے والے بہت تھے" — اس نے جواب دیا —
"لیکن یہ ہوشیار نکلی۔ سب کو 'اچھا، کل آؤں گی' کہہ کر اپنا کام نکالتی رہی۔"

"تم یہ بات کس طرح یقین سے کہہ سکتے ہو کہ وہ دامن بچاتی رہی؟"

"جو عورت مجھے نچا گئی اُس کے لئے یہ ڈھیلے ڈھیلے ٹھاکر اور نعیم وغیرہ تو کوئی ہستی نہیں رکھتے تھے" — اُس نے بلا جھجک کہا — "آپ نے کہا ہے کہ جھوٹ نہ بولنا۔ آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کو میری

مدد کی ضرورت ہے، اس لئے میں آپ کو اپنے دل کی بات سُنا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ مرنے والی کے ساتھ مجھے دلی ہمدردی تھی ..... داروغہ جی! میں شریف آدمی نہیں ہوں۔ سب مجھے بدمعاش اور غنڈہ کہتے ہیں۔ مجھے بدمعاشی اور غنڈہ گردی کی اُجرت ملتی ہے لیکن میرے اندر انسان کا دل ہے۔ اس عورت کو میں بُری نظر سے دیکھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اپنے بیمار خاوند سے یہ تنگ آگئی ہوگی اور مجھ جیسے آدمی کے ساتھ فوراً دوستی کر لے گی۔ اُس نے مجھے دوستی کا دھوکہ دیا اور کہا کہ وہ میرے ساتھ گھر سے بھاگ چلے گی۔ اُس نے مجھ سے پیسے مانگے۔ میں نے دے دیئے ....

"اُس نے مجھے تین چار بار ٹالا تو میں سمجھ گیا کہ جھوٹے وعدے کر رہی ہے۔ میں نے ایک شام اُسے پکڑ لیا۔ ہم جھونپڑوں سے کچھ دُور تھے۔ میں اُس کے راستے میں کھڑا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ خاوند کا علاج چھوڑ دو۔ یہ اپنی موت مر جائے گا، اور اگر پسند کرو تو میں تمہیں کچھ لا دیتا ہوں۔ دوائی کے بہانے اسے کھلا دو۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ میں فوراً اُس کی ارتھی اٹھوا کر جلانے کا انتظام کر دوں گا .... داروغہ حضور! وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے اندھیرے میں اُس کی سسکیاں سُنیں۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے کہا — چھوٹا ٹھاکر مجھے پیسے دیتا ہے اور وہ بھی میرے ساتھ ایسی ہی باتیں کرتا ہے جیسی تم کر رہے ہو۔ مجھے تو یہ اُمید تھی کہ تم میری حفاظت اُس سے زیادہ کرو گے جتنی ٹھاکر کی کرتے

ہو۔ لیکن تم اُجرت کے بھوکے ہو۔ میں تمہاری ذات برادری کی بیٹی ہوں۔ تم میں غیرت ہوتی تو اپنی ذات کی بیٹی کا خیال کرتے۔ تم مرد نہیں ہو۔ جو مردانگی تم میں ہونی چاہیئے تھی وہ مجھ میں ہے۔ میں اس کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی تھی۔ وہ بیمار ہو گیا ہے۔ اسے چھوڑ کر نہیں بھاگوں گی۔ تم نے مجھے جو پیسے دیتے ہیں وہ واپس کر دوں گی۔ تم بے غیرت ہو،....

"داروغہ صاحب! اُس نے میرا خون گرما دیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ چھوٹا ٹھاکر بھی اُسے میری طرح پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اس عورت کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ 'آج سے مجھے اپنا بھائی سمجھو' ــــ وہ بہت روتی۔ میں نے دوسرے دن چھوٹے ٹھاکر سے کہا کہ میں مزارعوں وغیرہ کو دبلتے رکھنے کے لئے بدمعاشی اور ظلم کرتا ہوں لیکن یہ سن لو کہ میں تمہیں اپنی کسی عورت کے ساتھ بدمعاشی نہیں کرنے دوں گا۔ وہ پہلے تو ہنسا، پھر اُس نے اس عورت کا نام لے کر کہا کہ اسے پھانس دو۔ مجھے طیش آ گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے کنجر سمجھتے ہو؟ اسی عورت کے متعلق تو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اس پر بُری نظر نہ رکھنا۔ وہ مجھ پر رُعب کسنے لگا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ دُنیا دیکھے گی کہ کون زندہ ہے اور کس کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے۔ وہ ڈر گیا۔ میں روزانہ مقتولہ سے پوچھنے لگا کہ چھوٹے ٹھاکر نے اُسے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہی۔ اُس نے بتایا کہ ٹھاکر کہتا ہے کہ وہ (مقتولہ) مجھ سے تعلقات توڑ لے۔"

"کیا یہ شک کیا جا سکتا ہے کہ مقتولہ کو ٹھاکر نے قتل کرایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اُس شخص میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں ہے" اُس نے جواب دیا۔ "وہ بے چاری مر گئی ہے اور بھید اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اُس کے اور ٹھاکر کے درمیان کیا بات ہوئی اور وہ کس طرح اور کس وقت قتل ہو گئی۔ ہمارے لوگ بھُوکے ننگے ہیں۔ کسی نے ٹھاکر سے رقم لے کر اس عورت کو قتل کر دیا ہو گا۔ میں کھوج لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر شہر میں وہ کسی کے جال میں آگئی ہو تو وہ میرے علم میں نہیں۔"

"مقتولہ تمہیں سب کچھ بتا دیتی تھی" میں نے کہا۔ "اُس نے کسی اور کا کبھی نام نہیں لیا تھا؟"

"یہی بتاتی تھی کہ جدھر جاتی ہوں لوگ بھُوکی نظروں سے دیکھتے ہیں" اُس نے کہا۔ "اُسے زیادہ پریشانی چھوٹے ٹھاکر کی طرف سے تھی۔ اس لئے اُسے دھمکی بھی دی تھی۔"

اس آدمی نے مجھے متاثر کر لیا تھا۔ مجرم اور عادی بدمعاش چالاک ہوتے ہیں۔ زبان کے کرتب بھی دکھاتے ہیں لیکن ذرا تجربہ ہو تو چہرے سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ شخص کس حد تک سچا ہے۔ میں نے اس آدمی پر اعتبار کر لیا اور اُس مزارعہ کو بلایا جس نے لاش دیکھی تھی۔ میں نے بدمعاش مزارعہ سے اس شخص کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اتنا

دلیر نہیں کہ کسی کو قتل کرے اور اتنا بُزدل بھی نہیں کہ لالچ سے اندھا ہو کر قتل نہ کرے۔

میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ وہ رات کے آخری پہر بینگنوں کے کھیت میں کیا کرنے گیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ رہٹ چلایا تھا اور کسی اور کیاریوں والے کھیت کو پانی لگانا تھا۔

"تم نے اندھیرے میں لاش کس طرح دیکھ لی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"مینڈھ کے ساتھ ہی پڑی تھی، نظر آگئی۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"ماچس جلا کر دیکھا" اُس نے کہا —"پھر میں چھوٹے ٹھاکر کو جگانے چلا گیا۔"

"اُس نے وہاں جاکر لاش دیکھی تھی؟"

"جی ہاں!" اُس نے جواب دیا —"وہ لالٹین جلا لایا اور ہم دونوں نے لاش دیکھی۔"

"ٹھاکر نے کیا کہا تھا؟"

"اُس نے حیران ہو کر کہا تھا —'ارے اس بدبخت کو کس نے مار ڈالا؟' — پھر اُس نے گالی دے کر کہا تھا کہ یہ ہر کسی کو دھوکے دیتی پھرتی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے اس (بدمعاش مزارعے) کا نام لیا اور کہا تھا کہ یہ اس کی کارستانی ہو گی۔"

میں نے اس شخص پر بہت جرح کی مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اسے میں نے

مشتبہ کی فہرست میں شامل کر لیا۔ ضروری نہیں تھا کہ پہلی ہی پوچھ گچھ میں مجھے سراغ مل جاتا۔ اس مزارعے کے گھر سے کلہاڑی برآمد ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ یہ کہہ کر بھیج دیا کہ اس کی جوتی لے آئے۔ جائے واردات پر لوگوں کے پتوں پر جو کھُرے ملے تھے وہ ننگے پاؤں کے نہیں جوتی کے تھے۔

"بڑے ٹھاکر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے بدمعاش مزارعے سے پوچھا۔

"شیطان ہے" — اُس نے جواب دیا — "عورت کے معاملے میں راکشش ہے۔ اُس کی بیوی مر چکی ہے۔"

"مقتولہ نے کبھی اُس کا ذکر نہیں کیا تھا؟"

"نہیں" — اس نے جواب دیا — "وہ شہر میں رہتا ہے۔ مقتولہ شہر جایا کرتی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کے گھر جاتی ہو۔"

قبرستان میں خون

میرے دماغ میں تفتیش ایک اور رُخ بدلنے لگی۔ مجھے بڑا ٹھاکر قتل میں ملوث ہوتا نظر آنے لگا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اُس نے مقتولہ جیسی شکل و صورت اور عمر کی لڑکی کو نظر انداز کیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے مقتولہ نے اُس کی رقم ہضم کر کے اُسے دھوکہ دینے اور اُس کے جال سے بچنے

کی کوشش کی ہو اور ٹھاکر نے اُسے اپنے گھر میں قتل کر کے یا کرا کے لاش یہاں پھینک دی ہو۔ مگر سوچنے والی بات یہ بھی کہ لاش اُس نے اپنے باغیچے میں کیوں پھینکوائی؟ دوسری صورت یہ بھی کہ چھوٹے ٹھاکر نے مقتولہ کے پیچھے اپنے گھر میں فساد پیدا کر رکھا ہو۔ اُس کی بیوی تو یونہی سی تھی۔ اُس کے گھر کی ناچاقی کی اطلاع بڑے ٹھاکر کو مل گئی ہو۔ اُس نے اپنے بیٹے کو برا بھلا کہا ہو جس کا کچھ اثر نہ دیکھ کر اُس نے مقتولہ کو راستے سے ہٹانے کے لئے اُسے قتل کرا دیا ہو۔ یہاں پھر سوال پیدا ہوا کہ لاش اپنے ہی باغیچے میں کیوں پھینکی گئی؟

مجھے اس پر بھی غور کرنا تھا کہ بڑے ٹھاکر نے مجھ پر زور دیا تھا کہ میں تفتیش نہ کروں اور کیس گول کر دوں۔ اُس کے اس مشورے یا مطالبے میں ان غریب لوگوں کی نفرت بھی پائی جاتی تھی اور شک بھی کہ قتل کی واردات اسی نے کرائی ہے۔ میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ بڑے ٹھاکر کو بھی مشتبہ قرار دے کر اُسے تھانے لے چلوں اور اس کے گھر کی تلاشی لوں، پھر مزارعوں سے یہ معلوم کروں کہ رات کون سا مزارعہ یا نوکر بڑے ٹھاکر کے گھر گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دن کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو اپنے گھر بھیج کر اپنا کھانا منگوایا تھا۔ باغیچے میں سب ہندو تھے۔ میں اُن کا کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ قتل کی واردات کہاں ہوئی اور قاتل کون ہے۔ میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ بڑے ٹھاکر

سے شہر والے گھر کی بھی تلاشی لوں گا اور باپ بیٹے کو رگڑ دوں گا۔ اتنے میں کھوجی واپس آ گیا۔ تھکن سے اُس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ وہ میرے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر تقریباً گر پڑا۔ کھرا اُٹھانا آسان کام نہیں ہوتا۔ جسم کی نسبت دماغ پر اور آنکھوں پر زیادہ زور پڑتا ہے۔

"ہار گئے لالہ؟" — میں نے کہا۔

اُس نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا، پھر مجھے دیکھا۔ میں سمجھ گیا۔ میں نے دونوں مزارعوں کو وہاں سے اُٹھا دیا۔

"آپ کو ایک اور رپورٹ نہیں ملی؟" — کھوجی نے پوچھا۔

"نہیں تو" — میں نے چونک کر کہا — "کوئی اور مارا گیا ہے؟"

"یا تو کوئی اور مارا گیا ہے یا میں نے اس قتل کا موقعۂ واردات معلوم کر لیا ہے" — اس نے کہا — "میں نے کھرا اُٹھایا تو نالے کے کنارے جا پہنچا۔ (وہاں ایک خشک نالہ تھا) کھیتوں کی مینڈھوں پر کھرا بہت ہی مشکل سے ڈھونڈا۔ دیکھ لیں، سارا دن گزر گیا ہے۔ بیس بیس قدم تو کوئی کھرا ملتا ہی نہیں۔ کئی طرف بھٹک بھٹک کر کھرا ملا اور نالے میں اُتر گیا۔ پار گیا تو کھرا خالی کھیتوں میں سے ہوتا قبرستان میں جا پہنچا۔ آدمی ایک نہیں دو ہیں۔ جہاں تک کھرے نے پہنچایا وہاں قبرستان میں رہنے والا ایک ملنگ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ صبح سے پہرے پر بیٹھا ہوں ادھر سے کوئی نہیں آیا۔"

میرا ایک کانسٹیبل کھوجی کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے ان الفاظ

میں رپورٹ دی ــ "قبرستان کے ساتھ ایک نشیب میں بہت سا خون پڑا ہے۔ اس سے کچھ دُور ایک جُوتی پڑی ہے۔ راستے میں ایک جگہ چادر نما دوپٹہ پڑا ہے جو خون سے بھرا ہوا ہے۔ جُوتی اور دوپٹے کو ہم نے وہیں رہنے دیا ہے۔ ان کے ارد گرد ڈھیلے اور پتھر رکھ آئے ہیں۔ ملنگ نے بتایا ہے کہ اُس نے سورج نکلنے کے بعد یہ خون دیکھا تھا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ یہ کسی انسان کا خون ہے۔ ملنگ نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے رات کو ایک چیخ سُنی تھی لیکن وہ باہر نہیں نکلا تھا۔ دوسرے دن خون دیکھ کر وہ تھانے چلا گیا۔ ہم تو یہاں تھے۔ وہ تھانے میں کسی کانسٹیبل کو بتا آیا اور خون کی رکھوالی پہ بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک آپ کے انتظار میں بیٹھا ہے۔"

یہ مقتولہ کا ہی خون ہو سکتا تھا۔ کھوجی اور یہ کانسٹیبل کھرا دیکھتے وہاں تک پہنچے تھے۔ جُوتی اور دوپٹہ شہادت دیتے تھے کہ مقتولہ کو وہیں قتل کیا گیا ہے جہاں خون ہے۔ اگر یہ رپورٹ مجھے جلدی مل جاتی تو میں فوراً وہاں پہنچتا۔ بعد میں پتہ چلا کہ قبرستان کے ملنگ نے تھانے میں جا کر اطلاع دی تھی لیکن وہاں کوئی ذمہ دار آدمی نہیں تھا۔ میرا اے۔ ایس۔ آئی کسی کیس کی گواہی دینے باہر گیا ہُوا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ تھا۔ پیچھے جو رہ گئے تھے انہیں قبرستان میں خون کی رپورٹ ملی تو اسے اہمیت نہ دی۔ انہوں نے مجھے باغیچے میں اطلاع دینے کی بجائے میری واپسی کا انتظار بہتر سمجھا۔ اتفاق سے مجھے رپورٹ مل گئی۔ میں فوراً

قبرستان پہنچنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں نے کانسٹیبلوں کو بلا کر تھانے چلنے کو کہا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو اپنے ساتھ رکھا۔ کانسٹیبلوں کے ساتھ جنہیں تھانے چلنے کو کہا ان میں بڑا ٹھاکر اور اُس کا بیٹا تھا۔ بدمعاش مزارعہ اور وہ مزارعہ بھی تھا جس نے لاش دیکھی تھی۔ میں نے کانسٹیبلوں کو سختی سے ہدایت دی کہ بڑے ٹھاکر کو اپنے گھر ایک منٹ کے لئے بھی نہ جانے دیں۔ وہ بہت سٹپٹایا۔ اُس نے منت سماجت کی اور رشوت بھی پیش کی۔ مجھے آخر دھمکی دینی پڑی کہ وہ تھانے نہ گیا تو میں ہتھکڑی لگا کر لے جاؤں گا۔

انسانی پنجر، عبرت ناک

قبرستان قصبے کے ساتھ تھا۔ باغیچے اور قبرستان میں یہ فرق تھا کہ قبرستان جنوب میں اور باغیچہ مغرب میں تھا۔ میں قبرستان میں کھوجی اور ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ اُس راستے سے گیا جس راستے یہ دونوں کھُرے دیکھتے گئے تھے۔ کھوجی نے جگہ جگہ نشان لگا رکھے تھے۔ وہاں مجرموں کے کھُرے تھے۔ خشک نالے میں ریتلی مٹی تھی۔ وہاں کھُرے زیادہ صاف تھے۔ ان میں سے ایک کھُرا اس کھُرے کے ساتھ ملتا تھا جو بینگنوں کے کیارے میں لاش کے قریب دیکھا گیا تھا۔ راستے کے کھُرے بتاتے تھے کہ یہ دو آدمی ہیں۔ نالے میں جہاں ریتلی مٹی تھی وہاں کھُرے ایک جگہ گڈمڈ تھے۔ تھوڑا آگے جا کر دائیں بائیں ہو گئے تھے۔

"کچھ سمجھ آتی دار وغہ جی؟" کھوجی نے پوچھا اور کہا — "یہاں ایک آدمی نے لاش اپنے کندھوں سے اُتار کر دوسرے آدمی کے کندھوں یا پیٹھ پر رکھ دی ہے۔ آگے دیکھیں" — اس نے پاؤں کے دو نشان دکھا کر کہا — "یہاں لاش اس آدمی نے اُٹھا رکھی ہے۔ دوسرے آدمی پر کوئی وزن نہیں" — یہ کھوجیوں کا کمال ہوتا ہے کہ کھُرا دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ اس آدمی نے وزن اٹھا رکھا ہے یا نہیں۔ بعض تجربہ کار کھوجی وزن کا اندازہ بھی بتا دیا کرتے تھے۔

نالے کے دوسرے کنارے پر چڑھے تو دوپٹہ پڑا تھا۔ یہ عام راستہ نہیں تھا۔ مجرموں نے فاصلہ کم کرنے کے لئے اصل راستہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے دوپٹہ اُٹھا کر دیکھا۔ اس پر بے شمار خون خشک ہو گیا تھا۔ ایک جگہ سے دوپٹہ کٹا ہوا تھا۔ یہ حصہ سر پر تھا۔ کلہاڑی اس جگہ لگی تھی۔ یہ بلاشک و شبہ مقتولہ کا دوپٹہ تھا۔ قبرستان میں گئے تو کھوجی مجھے ایک نشیب میں لے گیا۔ یہ ایک وسیع نشیب تھا۔ برسات میں قبرستان کا پانی اس نشیب میں گرتا تھا۔ نشیب کے اُس طرف کے دو کنارے جو قبرستان کی طرف تھے دیوار کی طرح عمودی تھے۔ کسی زمانے میں یہ نشیب بھی جسے آپ قدرتی تالاب بھی کہہ سکتے ہیں قبرستان کا حصہ تھا۔ برسات کا پانی اس کے کنارے بہاتا رہا اور یہ وسیع ہوتا رہا۔

اس کے ایک عمودی کنارے کے وسط میں انسانی ڈھانچے نظر آتے۔ یہ بہت ہی پُرانی قبریں تھیں جو صدیوں کی بارشوں سے ننگی

ہوگئی تھیں۔ میں نے ایک قطار میں ایسے پانچ چھ ڈھانچے دیکھے۔ کھوپڑیاں دیوار میں پھنسی ہوئی تھیں۔ باقی ڈھانچوں میں سے کچھ ہڈیاں نیچے گر پڑی تھیں۔ منظر ڈراؤنا تھا اور جذباتی بھی۔ معلوم نہیں یہ کون تھے اور کیسے تھے جن کی ہڈیاں ننگی ہو گئی تھیں اور گر بھی رہی تھیں۔ زندگی میں یہ زمین پر تکبّر سے سر اُونچا کر کے چلتے پھرتے ہوں گے۔ اپنے سے کمتر انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتے ہوں گے۔ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ ہم جیسا کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں ہُوا۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ اُن کی اصلیت یہ ہے کہ مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو جائیں گے اور اُن کی ہڈیاں الگ الگ ہو کر بہہ جائیں گی۔ میں نے ان کی کھوپڑیوں اور ڈھانچوں کو دیکھا۔ انہیں زمین نے جکڑ رکھا تھا۔ آنکھوں کے سوراخوں اور منہ میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ پسلیوں کے جس پنجرے میں اچھی بُری خواہشوں اور اچھے بُرے ارادوں سے بھرا ہُوا دل ہُوا کرتا تھا وہاں بھی مٹی بھری ہوئی تھی۔

ان میں کوئی پنجر کسی عورت کا ہو گا جسے اپنے حُسن پر ناز ہو گا اور کوئی کسی مرد کا ہو گا جسے اپنی مردانگی اور دولت پر فخر ہو گا مگر سب حشرات الارض کی خوراک بن گئے، اور اب اُن کے پنجر عبرت کا سامان بنے ہوئے تھے۔ مگر ہم میں سے کوئی بھی عبرت حاصل نہیں کرتا۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ایک روز اُس کی بھی ہڈیوں کا پنجر زمین کی گرفت میں ہو گا۔ جھوٹ بولنے والے مُنہ میں مٹی بھری ہوئی

ہو گی۔ کھوپڑی خالی ہو گی۔ گناہوں کے خیالوں کی جگہ مٹی بھری ہوتی ہو گی۔ اگر ہم سب اپنا انجام اپنے سامنے رکھیں تو ہم سب کسی وعظ کے بغیر پیار اور محبت، نیکی اور عبادت کے پُتلے بن جائیں۔

میں انسان کی اصلیت دیکھ رہا تھا۔ وہ جہاں سے آیا تھا اُسے وہیں پڑا دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے یاد آگیا کہ میں تھانیدار ہوں۔ میں ان سوچوں سے نکل آیا اور اپنے انجام کو ذہن سے اُتار کر تھانیدار اور داروغہ حضور بن گیا۔ مجھے خون دکھایا جا رہا تھا۔ یہ خون نشیب کی دیوار سے تین چار گز دُور تھا۔ اس سے ڈیڑھ دو گز اوپر ایک انسانی ڈھانچہ مٹی کی دیوار میں پھنسا ہوا تھا۔ وہاں سے کھودی ہوتی مٹی نیچے آتی ہوئی تھی۔ پنجر کے نیچے جگہ ڈھلانی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس پنجر کے ساتھ کھوپڑی نہیں ہے۔ جہاں کھوپڑی ہونی چاہیے تھی وہاں صاف نظر آرہا تھا کہ جگہ کھودی گئی ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں بھی دشواری نہ ہوتی کہ یہاں سے کھوپڑی نکالی گئی ہے۔ باقی جو پنجر تھے اُن کی کھوپڑیاں اُن کے ساتھ تھیں۔

واردات پُراسرار ہو گئی

قبرستان کے ملنگ نے یہ عقلمندی کی تھی کہ وہاں خون دیکھ کر اپنے ایک ساتھی کا پہرہ لگا دیا اور خود تھانے چلا گیا تھا۔ واپس آ کر

وہ خود بھرے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کھرے محفوظ رہے تھے۔ میں نے خون کے اردگرد زمین پر دیکھنا شروع کیا تو مجھے ایک دو ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے نظر آئے۔ میں نے مقتولہ کے بازو سے جو چوڑیاں توڑ کر جیب میں رکھی تھیں ان کے ساتھ ملائے۔ وہ ایک جیسے تھے۔ وہی قسم، وہی رنگ۔ چند قدم دور جوتی کا ایک پاؤں پڑا تھا۔ وہ اُٹھایا۔ یہ مقتولہ کا تھا۔ دوسرے پاؤں کی جوتی میرے پاس تھی۔ خون میں مجھے تین چار لمبے لمبے بال مل گئے۔ یہ زنانہ بال تھے۔ وہاں دو آدمیوں کے کھرے تھے۔ مقتولہ کے تڑپنے کے نشان بھی تھے۔

واردات پُر اسرار ہو گئی۔ مجھے کچھ سوال پریشان کرنے لگے۔ مقتولہ یہاں کس طرح آئی؟ کیوں آئی؟ کیا اسے لایا گیا تھا؟ کس نیت سے لایا گیا تھا؟ مجھے ابھی پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں ملی تھی اس لئے مجھے معلوم نہیں تھا کہ قتل سے پہلے مقتولہ کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے میں اس بنجر کی کھوپڑی کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا جو خون کے اُدھر کنارے کے وسط میں زمین سے پیوست تھا۔ وہاں سے کھوپڑی نکالی گئی تھی اور کھدائی کی مٹی بتا رہی تھی کہ ایک دن سے زیادہ پرانی نہیں۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آیا کہ مقتولہ کے ناخنوں میں مٹی پھنسی ہوئی دیکھی تھی۔ تو کیا یہ کھوپڑی مقتولہ نے نکالی تھی؟ اس خیال سے مجھے یہ خیال آیا کہ مقتولہ اپنے خاوند کی بیماری سے پریشان تھی مجھے بتایا گیا تھا کہ اس نے کئی جگہوں سے علاج کرایا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کسی کے بتانے پر وہ کوئی

لُوٹ کرنے کے لئے یہاں سے کھوپڑی نکالنے آئی ہو اور کسی مسلمان نے اسے دیکھ لیا ہو اور اسے قتل کر دیا ہو، مگر پیچیدگی یہ تھی کہ لاش ٹھاکر کے باغیچے میں کیوں پھینکی گئی ؟ اگر کسی مسلمان نے جوش میں آکر اور مقتولہ کو ہندو سمجھ کر قتل کر دیا ہوتا تو لاش وہیں پڑی رہنے دیتا۔

مجھے ملنگ کا خیال آیا جس نے خون دیکھا تھا۔ اُس سے میں نے بہت کچھ پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ رات اُس نے ایک چیخ سُنی تھی۔ اُس وقت وہ چرس کے نشے میں تھا۔ صبح وہ نشیب کے وسط میں جو تھوڑا سا پانی جمع تھا وہاں ہاتھ منہ دھونے آیا تو اُسے خون نظر آیا۔ اُسے رات کی چیخ یاد آئی۔ اس سے اُس نے شک کیا کہ رات یہاں کوئی قتل ہوا ہے۔ وہ تھانے چلا گیا۔ ملنگ قبرستان میں ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا جو موقعہ واردات سے تقریباً پچاس قدم دُور تھی۔

یہ وہ واردات تھی جو تھانیداروں اور سراغرسانوں کو بھول بھلیوں میں پھینک دیتی ہے۔ باہر نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملتا۔ زمین بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ مجھے ٹھاکر اور اُس کا بیٹا بے گناہ نظر آنے لگے۔ وہ مقتولہ کو یہاں لاکر کیوں قتل کرتے ہیں مجھے کوئی جواز نہیں مل رہا تھا۔ یہ دو آدمی کوئی اور تھے جن کے وہاں کھُرے نظر آرہے تھے ...... میں نے دیکھا، کھوجی غائب تھا۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ بہت دیر بعد وہ نشیب کی دوسری طرف سے جہاں ڈھلان تھی، تیزی سے اُترتا آرہا تھا۔ وہاں سے اُس نے مجھے اشارے سے بُلایا۔ میں گیا۔ اُس نے مجھے تین کھُرے دکھائے۔

"مقتولہ دو آدمیوں کے ساتھ اِدھر سے آئی تھی"۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میں قبرستان میں تھوڑی دُور تک دیکھ آیا ہُوں۔ ان تینوں کے آنے کی سمت معلوم ہو گئی ہے۔"

میں نے آگے جا کر دیکھا۔ اگر کھوجی نے سراغ پا لیا تھا تو مقتولہ باغیچے کی طرف سے نہیں دوسری طرف سے آئی تھی۔ اُس کے ساتھ دو آدمی تھے ۔۔۔ کیا یہ تینوں کھوپڑی نکالنے آئے تھے؟ ۔۔۔ میں سوچ سوچ کر بپٹپٹا اُٹھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کھوپڑی ایک رات پہلے کسی اور نے نکالی ہو اور مقتولہ کو یہ دو آدمی بُری نیت سے یہاں لاتے ہوں اور بعد میں اسے قتل کر دیا ہو مگر پھر اسی سوال نے میرا راستہ روک لیا کہ لاش اُٹھا کر باغیچے میں کیوں پھینکی گئی؟ اس سوال کا یہ جواب میرے ذہن میں آیا کہ یہ دو آدمی عادی مجرم ہوں گے۔ انہیں معلوم ہو گا کہ یہ ٹھاکر کے باغیچے کی عورت ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے پولیس کو گمراہ کرنے کے لئے لاش اُٹھائی اور باغیچے میں جا پھینکی مگر مجھے اپنی اس دلیل میں کوئی جان نظر نہیں آئی تھی۔

ایک آدمی آسمان سے اُترا

میں قبرستان میں کھڑا تھا۔ کھوجی مجھے کھُرے دکھا رہا تھا میرے ہیڈ کانسٹیبل نے سر سے ایک طرف اشارہ کر کے مجھے کہا ۔۔۔ "وہ آدمی

جو دُور کھڑا ہے، اسے ذرا غور سے دیکھیں"۔ میں نے اُس کی طرف ایسے انداز سے دیکھا جیسے خاص طور پر اُسی کو نہ دیکھا ہو۔ میں نے اُدھر سے مُنہ پھیر کر ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھا۔ "کیا ہے اس آدمی میں؟"

"یہ مجھے دوسرے تماشائیوں سے مختلف لگتا ہے"۔ ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "ہم نیچے گہرائی میں تھے تو میں نے اسے دوسرے کنارے پر الگ تھلگ کھڑے دیکھا تھا۔ دوسرے تماشائی ہمارے سر پر کھڑے تھے۔ ہم جب باغیچے سے کھُرے دیکھتے آرہے تھے تو میں نے اسے دُور دُور اپنے ساتھ آتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے ہم جب باغیچے میں لاش دیکھ رہے تھے تو بھی مَیں نے اسے دُور کھڑے دیکھا۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ ہم جب صبح تھانے سے نکلے تھے تو یہ آدمی تھانے کے احاطے سے باہر کھڑا تھا۔ ہم احاطے سے نکلے تو یہ پرے چلا گیا تھا۔ یہ صبح سے ہمیں دیکھ رہا ہے، رہتا دُور دُور ہے"۔

کھوجی سُن رہا تھا۔ اُس نے زمین پر بیٹھے بیٹھے اس آدمی کو دیکھا اور بولا۔ "میں جب باغیچے سے کھُرا اُٹھا کر اس طرف آیا تھا تو مَیں نے بھی اس آدمی کو دیکھا تھا۔ دُور دُور ہماری رفتار سے چلتا آرہا تھا۔ میں کانسٹیبل کے ساتھ جب واپس آپ کو ساتھ لانے گیا تو بھی اسے دُور دُور باغیچے کی طرف جاتے دیکھا تھا"۔

ہیڈ کانسٹیبل نے مجھ پر کوئی عجیب و غریب انکشاف نہیں کیا تھا۔

یہ عام طور پر ہوتا ہے کہ قتل یا ڈاکے کی جائے واردات پر جب پولیس جاتی ہے تو تماشائی جمع ہو جاتے ہیں۔ مجرم بھی بعض اوقات تماشائیوں میں شامل ہو کر دیکھنے لگتے ہیں کہ پولیس کیا کر رہی ہے اور اسے کیا سراغ ملا ہے۔ مجرم خود نہ آئیں تو ان کے جاسوس آ جاتے ہیں۔ اسی لئے میں تماشائیوں کو دور بھگا دیا کرتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو بجا طور پر شک ہوا تھا کہ یہ آدمی عام قسم کا تماشائی نہیں۔ اس کا ہمارے ساتھ لگے رہنا بے معنی نہیں تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اسے یہاں بلاؤ۔

وہ ہم سے کوئی ڈیڑھ سو گز دور ہو گا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اُسے "اے بھائی، ذرا یہاں آنا" کہہ کر بلایا۔ اُس نے دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بلند آواز سے کہا — "میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ بھاگ کے آؤ" — اُس نے پیٹھ ہماری طرف کر لی اور آہستہ آہستہ دوسری طرف چل پڑا۔ ہیڈ کانسٹیبل میرے کہنے پر اُس کے پیچھے گیا۔ اس آدمی نے پیچھے دیکھا اور تیز چل پڑا۔ میں نے کہا — "پکڑ لاؤ اسے" — ہیڈ کانسٹیبل دوڑ پڑا۔ اس آدمی نے پیچھے دیکھا اور وہ بھی دوڑ پڑا۔ میں ابھی جوان تھا۔ قد کی وجہ سے قدم لمبے تھے۔ میں پوری رفتار سے دوڑا۔ آگے سے دو تین آدمی آ رہے تھے۔ انہیں آواز دی کہ اس آدمی کو پکڑیں۔ اُنہوں نے اس کا راستہ روکا تو اُس نے رُخ بدل لیا۔ کمبخت قدموں کا تیز تھا۔ وہ جدھر دوڑا اُدھر کھیت تھے۔ میں نے بھی رُخ بدل لیا۔

دوڑتے دوڑتے مجھے خیال آیا کہ میں احمق تو نہیں؟ لوگ پولیس

سے ڈرتے ہیں۔ بعض پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ آدمی پولیس سے دہشت زدہ ہونے والا ہو سکتا تھا۔ بہت بزدل ہوگا۔ میں اُلو کی طرح اُس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ بات کچھ بھی نہ نکلی تو میں شرمندگی کا مقابلہ کس طرح کروں گا، مگر میری اُس وقت ذہنی حالت ایسی تھی کہ میں تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔ واردات ایک معمہ معلوم ہوتی تھی جسے پُراسرار کہا جاتا ہے۔ میری تفتیش کو کوئی معجزہ ہی کامیاب کر سکتا تھا۔ میں نے تعاقب جاری رکھا۔ وہ جدھر جا رہا تھا، اُدھر سے دو تین دیہاتی آ رہے تھے۔ انہیں میں نے پکار کر اسے پکڑیں۔ اس آدمی نے نکل بھاگنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے ریوالور فائر کرنے کا ارادہ کیا لیکن فائر کیا نہیں کیونکہ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ یہ آدمی صرف ڈر سے بھاگ رہا ہوگا۔ گولی چلانا سنگین معاملہ ہوتا ہے۔

دیہاتیوں نے اُسے روک کر پکڑ لیا۔ میں جب اُس تک پہنچا تو اُس کی سانسیں اس قدر اکھڑی ہوئی تھیں کہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ میں اُسے ماروں پیٹوں گا۔ میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔ مجھے غصہ ضرور آیا تھا لیکن میں بادشاہ قسم کا تھانیدار نہیں تھا۔ میں نے اُسے ہنس کر کہا — "بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم تمہیں کھا جاتے گے؟" — اُس کی آنکھیں اُبل کر باہر آ رہی تھیں۔ مجھے دیکھے جا رہا تھا، بولتا کچھ بھی نہیں تھا۔

"نہ گھبراؤ یار!" — میں نے اُس کے کندھے دباتے ہوئے کہا —

"آؤ میرے ساتھ۔ ذرا آرام کرو۔ ڈرتے کیوں ہو؟"

میں نے اُس کا بازو پکڑا اور چلا تو وہ وہیں جما کھڑا رہا۔ میں نے اُسے گھسیٹا تو وہ بیٹھ گیا۔ میرے منہ کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا کہ اُس کا مُنہ کھُلا ہُوا تھا اور آنکھوں کے ڈھیلے باہر آرہے تھے۔ میں نے اُسے اُٹھنے کے لئے کہا تو وہ مجھے بدستور دیکھتا رہا۔

"یہ کوئی پاگل تو نہیں؟" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

اُس کا انداز پاگلوں جیسا ہی تھا۔ میں نے اس کا نام پُوچھا تو بھی وہ مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو؟ اُس نے قصبے کی طرف سر سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ پوچھا مسلمان ہو؟ اُس نے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا کہ مُسلمان ہوں۔ میں نے اُسے اُٹھنے کے لئے کہا مگر وہ مجھے دیکھتا رہا۔ اُٹھا نہیں۔ کھوجی کو میں نے دیکھا۔ وہ زمین کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس آدمی کو ساتھ لے چلو۔ کھوجی نے زمین پر اس کی جُوتی کے نشان دیکھ لئے تھے جو واردات والے کھُروں سے ملتے تھے۔ یہ دیسی جُوتی کے نشان نہیں تھے۔ اس آدمی کی جُوتی دیسی نہیں تھی۔

مجھے بچالو

ہم اُسے کچھ اُٹھا کر، کچھ دھکیل کر اور کچھ گھسیٹ کر لے گئے۔ قبرستان

کا ملنگ دو چار پائیاں اٹھا لایا تھا۔ چار پائیاں وہاں رکھی گئیں جہاں خون پڑا تھا۔ اس آدمی کو جہاں چار پائی پہ بٹھایا گیا وہاں سے اُسے خون منظر آ رہا تھا۔ وہ اُدھر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اُسے پانی پلایا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی یہ حالت تھی کہ پانی پینے لگا تو مٹی کا پیالہ اُس کے ہاتھوں میں چھلک رہا تھا۔ پانی اس کے کپڑوں پر بھی گرا۔ میں نے اُس کا ڈر دُور کرنے کے لئے ہنس کر کہا — "او تے تم مسلمان کے بچے ہو کر اتنا ڈرتے ہو۔ حوصلہ رکھو۔ ہم نے تمہیں ویسے ہی بلایا تھا" — مگر اُس کا حوصلہ ٹوٹتا ہی جا رہا تھا۔

"بھاگے کیوں تھے؟" — میں نے پوچھا۔

اُس کا رنگ زردی سے بدل کر سفید ہو گیا اور وہ خاموش رہا۔

"ہم سے ڈر گئے تھے؟"

وہ خاموش رہا۔ اُس کا سر ڈولنے لگا۔ چہرے پہ پسینے کے قطرے پھوٹ آئے اور وہ چار پائی پہ لڑھک گیا۔ اُس پہ غشی طاری ہو گئی تھی۔ اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تماشائی کچھ دُور کھڑے تھے۔ انہیں کہا کہ کہیں سے دودھ لے آؤ۔ ایک آدمی دوڑا گیا۔ اُس کا گھر کہیں قریب ہو گا۔ دودھ کا پیالہ لے آیا۔ اتنی دیر میں اس آدمی نے آنکھیں کھول دیں۔ اٹھا کر اسے دُودھ پلایا۔ وہ ہوش میں تو آ گیا لیکن بولتا نہیں تھا۔ میں اسے الگ لے گیا۔ پیار اور شفقت سے اسے بات کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر بے سُود۔

"تم غالباً یہ چاہتے ہو کہ میں پولیس والا رویہ اختیار کروں" — میں نے ذرا رُعب سے کہا — "ہمارے آگے پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ کون ہو تم؟ کیا کام کرتے ہو؟"

"حکیم کا بھتیجا ہوں" — اُس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

"یہاں کیا کرنے آتے تھے؟"

"ویسے ہی۔"

"بھاگے کیوں تھے؟"

وہ خاموش رہا۔ کھوجی نے اُس کا کھُرا دیکھ لیا تھا۔ میں اس آدمی کو اتنی آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا — "اس قتل کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"

اُس کا جسم بڑی زور سے کانپا اور وہ میرے قدموں میں گر پڑا۔ اس نے سر میرے پاؤں پہ رکھ دیا۔ دونوں ہاتھوں سے میرے ٹخنے پکڑ لیے۔ میں نے اُسے اُٹھایا۔ وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ آنسو بہے جا رہے تھے۔

"خدا کے بندے!" — میں نے جھنجھلا کر کہا — "کہہ دو میرا اس قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور مجھے سمجھا دو کہ تم صبح سے کیوں ہمارے ساتھ ساتھ رہے ہو۔ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔"

وہ روتا ہی رہا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر سرگوشی کی — "مجھے بچالو۔ میں آپ کا مسلمان بھائی ہوں۔"

"پھر یوں کہو کہ اس واردات کے ساتھ تمہارا گہرا تعلق ہے"۔
وہ پھر بھی خاموش رہا اور اس کی حالت پھر ویسی ہی ہونے لگی جیسی غشی سے پہلے ہوئی تھی۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ میں نے موقعۂ واردات کے متعلق جو کاغذی کارروائی کرنی تھی وہ مکمل کی۔ گواہ بنائے اور اس آدمی کو ساتھ لے کر میں تھانے چلا گیا۔ ٹھاکر، اس کا بیٹا اور دو مزارعے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑا ٹھاکر میرے پاس دوڑا آیا۔ کہنے لگا — "آپ نے ہمیں کیوں پابند کر لیا ہے؟ ہم کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے؟"
"جب تک مجھے آپ کی ضرورت ہے" — میں نے بے رُخی سے کہا — "آرام سے بیٹھ جائیں" — اور میں اپنے دفتر میں چلا گیا۔

شراب کام کر گئی

سرکاری ہسپتال قریب ہی تھا۔ ڈاکٹر وہیں رہتا تھا۔ میں اس آدمی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اسے ایک کمرے میں بٹھا کر ڈاکٹر کو ساری بات سُنائی اور اسے بتایا کہ اس آدمی پر مجھے شک ہے کہ واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہے مگر یہ بولتا نہیں بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی اور اچھی طرح معائنہ کر کے دو گولیاں اسے کھلا دیں۔ مجھے ڈاکٹر نے الگ کر کے کہا کہ اسے شراب پلاؤ، بول اُٹھے گا پھر ڈاکٹر

نے مجھے مقتولہ کے پوسٹ مارٹم کے متعلق بتایا۔ اُس نے پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ اُس نے موت کا جو وقت بتایا وہ آدھی رات یعنی رات بارہ بجے سے ڈیڑھ یا دو گھنٹے پہلے تھا۔

اس رپورٹ سے یہ ثابت ہو گیا کہ مقتولہ کو کسی اور نیت سے قتل کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ انتقامی قتل تھا لیکن میں حیران اس پر تھا کہ عورت سے جب انتقام لیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ قتل سے پہلے وحشیوں اور درندوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کیس میں ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ قاتل یا قاتلوں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔

میں اس آدمی کو تھانے لے آیا۔ راستے میں اس کے ساتھ دوستانہ سی باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے تعاون نہ کیا۔ تھانے جا کر میں نے ایک ہندو کانسٹیبل کو دیسی شراب لانے کو بھیجا۔ ڈاکٹر نے اس آدمی کو جو گولیاں دی تھیں ان کا اثر نظر آنے لگا تھا۔ اس کے جسم کا لرزہ ختم گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے شراب دھوکے میں پلاؤں گا لیکن اس نے دھوکے کے بغیر ہی قبول کر لی۔ کانسٹیبل نے یہ غلطی کی کر بوتل لا کر میری میز پر رکھ دی۔ میرا مشتبہ بوتل کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے مسکرا کر پوچھا۔۔۔ "پیو گے؟"۔۔۔ اُس نے سر ہلایا۔ میں نے گلاس اور پانی منگوایا۔ بوتل اور گلاس اُس کے آگے کر دیئے۔ میں اسے آزاد چھوڑنے کے لئے باہر نکل گیا اور برڈ سے ٹھاکر اور اُس کے بیٹے سے باتیں کرنے لگا۔

نصف گھنٹہ بعد میں اندر گیا تو اس آدمی نے بڑی شگفتہ آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "آپ نہیں ہیں گئے؟"

"نہ یار"۔ میں نے جواب دیا۔ "مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔"

"اس قتل کے سلسلے میں؟"

"ہاں!" میں نے کہا۔ "یہ سلسلہ تو مجھے راتوں کو جگائے رکھے گا۔"

"میں آپ کا کام آسان کر دوں؟" اس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں شراب کی مستی تھی۔ خوف کا اشارہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ شاید اس مقدار سے زیادہ پی گیا تھا جس کا وہ عادی تھا۔ اس نے کہا۔ "اگر میں آپ کا مسئلہ حل کر دوں تو مجھے کیا انعام ملے گا؟" اس نے قہقہہ لگایا جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔

"اتنا انعام ملے گا جو ساری عمر یاد رکھو گے"۔ میں نے جواب دیا۔

"ساری عمر"۔ اس نے جھومتے ہوئے کہا۔ "عمر قید۔ آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ آپ مجھے سزائے موت کی بجائے عمر قید دلائیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے عمر قید بھی نہ ملے؟"

"بالکل ہو سکتا ہے"۔ میں نے کہا۔ "تم جانتے ہو سلطانی گواہ کیا ہوتا ہے؟"

"جانتا ہوں"۔ اس نے کہا۔ "وعدہ ہوا؟"

"پکا وعدہ"۔ میں نے کہا۔ "تم میری مدد کرو گے تو کیا میں تمہاری مدد نہیں کروں گا؟ تمہارا مسلمان بھائی ہوں۔ مرنے والی کمبخت ہندو

تھی۔ بے فکر رہو۔"

اُس کا انداز بدمست شرابیوں کا تھا۔ ہنستا تھا اور قہقہے بھی لگاتا تھا۔ شراب میرا کام کر گئی تھی مگر مجھے یہ غم لگ گیا کہ نشہ اُتر جانے کے بعد یہ آدمی یہ نہ کہہ دے کہ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ وہ نشے کی حالت میں جو کچھ کہے وہ محض بے بنیاد ہو۔ تاہم اسے میں نے بولنے کا موقعہ دیا۔

"حکیم کو پکڑ لو" — اُس نے جھوم کر کہا — "وہاں سے ایک کھوپڑی ملے گی۔ کلہاڑی بھی وہیں ہے۔"

اُس نے حکیم کا جو ٹھکانہ بتایا وہ قصبے سے ذرا الگ ایک مکان تھا۔ درمیان میں چند ایک کھیت تھے۔

"ابھی جاؤ" — اُس نے کہا — "اسے اگر پتہ چل گیا کہ میں تھانے میں ہوں تو وہ بھاگ جائے گا۔ مجھے اُسی نے کہا تھا کہ پولیس پر نظر رکھو۔ اگر خطرہ ہو تو فوراً اطلاع دو۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ میری جگہ تم لوگ وہاں پہنچو۔"

دو سَو سال زندہ رہو جوان رہو

اس شخص سے میں نے اور جو کچھ پوچھا اور اُس نے جو کچھ بتایا اور نشے کی حالت میں اُس نے جو دلچسپ حرکتیں کیں وہ بڑی طویل تفصیلات

ہیں۔ میں آپ کو صرف کام کی باتیں سُنا رہا ہوں۔ اُس کی نشاندہی بڑی قیمتی تھی۔ حکیم کے گھر پر چھاپہ مارنا تھا۔ میں نے اس آدمی کو ساتھ لے جانا چاہا۔ اسے اُٹھایا لیکن وہ اچھی طرح چل بھی نہیں سکتا تھا۔ نشے کی حالت میں اسے ساتھ لے جانا مناسب بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ نشاندہی غلط ہو لیکن مجھے چھاپہ مارنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے نشاندہی کی تصدیق کے لئے اس آدمی سے پوچھا "اس حکیم کا مقتولہ کے ساتھ کیا تعلق تھا؟"

"وہ اپنے خاوند کے لئے دوائی لینے آیا کرتی تھی"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "نسخہ حکیم دیتا تھا۔ دوائی میرے ہاتھ کی بنی ہوتی تھی۔"

میں نے چھ کانسٹیبل ساتھ لئے۔ حکیم کے اس آدمی کو تھانے میں رہنے دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو اس کے پاس چھوڑا اور میں نے جا کر حکیم کے مکان کو محاصرے میں لے لیا۔ میں نے بڑے ٹھاکر اور بدمعاش مزارعہ کو بھی برآمدگی کی گواہی کے لئے ساتھ لیا تھا۔ دروازے پر دستک دی تو حکیم نے دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے بغیر اُسے اندر کو دھکیلا اور میں اندر چلا گیا۔ میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا۔ باقی پانچ مکان کے اردگرد کھڑے تھے۔ مکان آبادی سے الگ تھلگ تھا۔ میں نے ٹھاکر اور مزارعہ کو بھی اندر بلا لیا۔

"جناب حکیم صاحب!"۔۔۔ میں نے حکیم سے نرم سے لہجے میں کہا۔۔۔ "میں یہاں تک جو پہنچ گیا ہوں اس سے آپ سمجھ لیں کہ میں کسی شک

میں نہیں آیا پورے یقین کے ساتھ آیا ہوں۔ اگر آپ حکم دیں تو میں مکان کی تلاشی لے لیتا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ قبرستان سے نکالی ہوئی کھوپڑی اور وہ کلہاڑی جس سے آپ نے ایک عورت کو قتل کیا ہے خود ہی نکال دیں؟ اگر میں نے تلاشی لے کر یہ چیزیں برآمد کیں، تو آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تلاشی سے آپ کے کچھ اور جرائم بھی بے نقاب ہو جائیں۔"

اُس نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن اُس کے مُنہ سے بات نکل نہیں رہی تھی۔ اُسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کہے اور کس طرح کہے۔ میں نے اُسے کہا — "جناب کا ساتھی میرے تھانے میں ہے اور اقبالِ جرم کر چکا ہے۔ ہم آپ کو زحمت نہیں دیں گے"۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رازداری سے کہا — "قتل کے لئے کوئی عادی قاتل ساتھ رکھنا تھا۔ اتنا کچا آدمی خون ہضم نہیں کر سکتا۔"

اُس کا سر جھک گیا۔ اُس نے سر اُٹھایا اور زیرِ لب کہا — "آؤ" —

وہ ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس کمرے کی بدبو نے مجھے جکڑ دیا۔ کمرہ فراخ تھا۔ چھت جالوں سے اٹی ہوئی تھی۔ کمرے میں کنستر، چھوٹے بڑے مرتبان، گٹھیاں اور تھیلیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان سب میں جڑی بوٹیاں وغیرہ تھیں۔ کمرے میں دھواں تھا۔ ایک کونے میں انگیٹھی میں کوئلے جل رہے تھے۔ ان پر ایک کنستر رکھا تھا جو اُوپر سے بند تھا۔ اس کے اُوپر سے ٹین کا ایک پائپ ایک

طرف کو نکلا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا سرا باریک تھا جس میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ یہ پائپ پانی میں سے گذارا گیا تھا۔

حکیم مجھے ذرا پرے لے گیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا۔" معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اس پر پردہ ڈال سکتے ہیں۔ قتل ہونے والی کا آگے پیچھے کوئی نہیں جو کیس اُٹھائے گا۔ میں آپ کو ایسی دوائی دوں گا جس سے آپ دو سو سال زندہ رہیں گے اور ہمیشہ جوان رہیں گے۔ ایک درجن بیویاں گھر میں رکھیں۔ آپ کی جوانی میں فرق نہیں آئے گا۔ میں یہ دوائی صرف اپنے لئے اور راجوں مہاراجوں کے لئے بنا رہا ہوں۔"

"دو سو سال زندہ رہوں گا؟" — میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"بلکہ اس سے بھی زیادہ" — اس نے کہا۔

"نہ حکیم صاحب!" — میں نے شگفتہ لہجے میں کہا — "اتنی لمبی عمر قید مجھے منظور نہیں۔ آپ مجھے ذرا جلدی فارغ کر دیں۔"

"کچھ نقد پیش کروں؟" — اُس نے کہا — "جو آپ کہیں مجھے منظور ہو گا۔"

"اگر آپ مجھے تین چیزیں پیش کر دیں تو میں آپ کا مشکور رہوں گا" — میں نے کہا۔

"فرمائیے" — اُس نے خوش ہو کر کہا — "ابھی حاضر کرتا ہوں۔"

"ایک کلہاڑی جس سے مقتولہ کو قتل کیا گیا ہے" — میں نے کہا —

ایک کھوپڑی جو قبرستان سے نکالی گئی ہے۔ تیسری چیز آپ کا اقبالی بیان ہے جو آپ دے دیں تو آپ کا مشکور ہوں گا ورنہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کے جرم کی شہادت مل گئی ہے۔“

قتل کا باعث، لقمان حکیم کا نسخہ تھا

اُس نے کچھ اور پس و پیش کی تو میں نے دو اور کانسٹیبل اندر بلا لیے اور انہیں کہا کہ سارے مکان کی تلاشی لو۔ حکیم ادھیڑ عمر مسلمان تھا۔ وہ ہمیں اندر جانے سے روکتا تھا، کہتا تھا اندر مستورات ہیں۔ میں نے مستورات بھی دیکھا۔ ایک کو میں اُس کی بیوی اور دوسری کو اُس کی بیٹی سمجھا لیکن اُس نے بتایا کہ دونوں اُس کی بیویاں ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ اُس نے کلہاڑی خود ہی نکال دی۔ پھر اُس نے آگ پر رکھے ہوئے کنستر کا ڈھکنا کھولا۔ رکی ہوئی بھاپ بادل کی طرح اُوپر کو اُٹھی اور کمرے میں ایسی بدبو پھیل گئی کہ ہم سب ناکوں پر رومال نہ رکھ لیتے تو شاید بے ہوش ہو جاتے۔ کنستر میں سے اُس نے کھوپڑی نکال کر باہر رکھ دی۔ کنستر میں اس نے نہ جانے اور کیا کچھ ڈال رکھا تھا۔ میں نے اس حکیم کی شہرت سُن رکھی تھی۔ دوائیوں کے علاوہ تعویذوں اور ٹونے ٹوٹکوں سے بھی علاج کرتا تھا۔

مکان کی تلاشی لے کر میں نے مشیر نامہ تیار کیا۔ ٹھاکر اور مرزا بے

کی گواہی ڈال کر انگوٹھے لگواتے اور حکیم کو تھانے لے گیا۔ اپنے دفتر میں داخل ہوا تو حکیم کو بھی اندر لے گیا۔ اس کا شاگرد ہیڈ کانسٹیبل کو قتل کی کہانی سنا رہا تھا اور نشے میں قہقہے لگا رہا تھا۔ حکیم کو دیکھ کر اس نے کہا — "آؤ، آؤ۔ یہ لو گلاس۔ پیو اور موج کرو۔"

حکیم نے جو گالیاں بکیں وہ اگر میں ساری لکھوں تو دو صفحوں میں آئیں گی۔ میں اگر اسے پکڑ نہ لیتا تو وہ اپنے بھتیجے پر ٹوٹ پڑتا۔ کھوپڑی کانسٹیبل نے اٹھا رکھی تھی جو اس نے میری میز پر رکھ دی۔ حکیم کا بھتیجا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے کھوپڑی کی طرف دیکھا تو اس کا نشہ ختم ہو گیا۔ اس کے چہرے پر وہی خوف آ گیا جو اس وقت اس پر طاری تھا جب اسے کھیتوں میں پکڑا گیا تھا۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے مجھے دیکھا اور کہا — "یہ میرے آگے سے اٹھا لو... خدا کے لئے اٹھا لو" — میں نے کھوپڑی وہاں سے اٹھوا دی۔ یہ خوفزدگی کی انتہا تھی۔ اتنے زیادہ نشے میں بھی وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ انسانی کھوپڑی کو دیکھ کر کسی انسان کا دل ٹھکانے نہیں رہتا۔ میں نے بھی جب قبرستان میں ہڈیوں کے پنجر دیکھے تھے تو مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

میں نے حکیم سے کہا — "آپ اگر پینا چاہیں تو پی لیں اور گھبرائیں نہیں۔"

حکیم نے گلاس بھی نہ مانگا۔ بوتل اٹھائی اور منہ سے لگا لی۔ میں نے اسے زیادہ نہ پینے دی۔ اسے تفتیش کے کمرے میں لے گیا اور کہا — "میں ایک اور بوتل منگوا لوں گا۔ پہلے کام کی باتیں کر لیں۔" میں اس

کا بیان ہوش میں لینا چاہتا تھا۔

اُس نے اقبالِ جرم کرنے سے پہلے مجھے ذرا پریشان کیا لیکن میری اُستادی کے آگے وہ زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ اُس نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ اُس کا کاروبار فراڈ ہے۔ وہ کہتا تھا کہ کھوپڑی سے جو دوائی بنا رہا تھا وہ آبِ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق اس دوائی میں صرف اشیاء شامل نہیں تھیں بلکہ اس میں ایک ٹونہ بھی شامل تھا۔ ٹونہ یہ تھا کہ کھوپڑی زمین سے یعنی قبر سے عورت نکالے۔ اس عورت پر چالیس روز ایک عمل پڑھ کر پھونکا جاتے۔ اکتالیسویں رات یہ عورت کھوپڑی نکالے۔ اس کھوپڑی کو اسی عورت کے خون سے دھویا جاتے لیکن خون عورت کے سر سے نکلے۔

آپ میں سے جو قارئین ٹونے ٹوٹکوں سے واقف نہیں حیران ہوں گے کہ کوئی ایسا ٹونہ بھی ہو سکتا ہے جو اس حکیم نے کیا تھا۔ انسان جتنے پسماندہ ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ اس قسم کی خرافات پہ یقین رکھتے ہیں۔ ہندو عجیب و غریب ٹونے کرتے تھے۔ ان کو دیکھا دیکھی مسلمان بھی ان کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ پاکستان کے دور دراز دیہات میں اب بھی عجیب و غریب بلکہ بھیانک ٹونوں کا رواج ہے۔ فریب کار عامل اور پیر وغیرہ خدا کے بعد کا درجہ حاصل کئے ہوتے ہیں۔

اس حکیم نے مجھے اپنا ٹونہ سنایا تو میں حیران نہیں ہوا۔ میں تو اس سے زیادہ خوفناک ٹونے ٹوٹکے دیکھ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ مقتولہ اپنے

خاوند کے علاج کے لئے اس کے پاس آنے لگی۔ اپنے خاوند کو بھی ساتھ لاتی تھی۔ حکیم نے اس کا علاج شروع کر دیا۔ مقتولہ کے متعلق اُس نے بتایا کہ اپنے خاوند کے لئے روتی تھی اور کہتی تھی کہ اس کی صحت کے لئے وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔ حکیم نے اعتراف کیا کہ اس عورت پر اس کی نظر خراب ہوگئی تھی لیکن وہ اُسے پوری طرح اپنے اثر اور کرامات کا قیدی بنا کر اپنی نیت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران اسے آباؤ اجداد کے پرانے کاغذوں میں سے ایک نسخہ ملا جو انسان کو ناقابلِ یقین حد تک طویل عمر دینے اور سدا جوان رکھنے کا اثر رکھتا تھا۔ یہ کاغذات گھر کے کوڑے کباڑ سے اتفاقیہ برآمد ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ نسخہ لقمان حکیم نے تیار کیا تھا۔ اُس نے نسخے کی تاریخ سنائی۔

نسخے میں (اُس کے بیان کے مطابق) کچھ الفاظ لکھے تھے جو ایک جوان عورت پر ہر روز پڑھنے اور پھونکنے تھے۔ عورت ایسی لازمی تھی جو جوان ہو، شادی شدہ ہو اور اُس کے بطن سے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا ہو۔ حکیم کے لئے مقتولہ صحیح عورت تھی۔ مقتولہ ڈیڑھ ماہ سے اپنے خاوند کے لئے دوائی لینے جا رہی تھی۔ تیسرے چوتھے دن جاتی تھی۔ حکیم کو یہ نسخہ ملا تو اُس نے مقتولہ سے کہا کہ وہ اب ہر روز اپنے خاوند کا حال بتانے آیا کرے تاکہ اسے دوائی بدل بدل کر دی جا سکے۔ اُس نے مقتولہ سے یہ بھی کہا کہ وہ اب دوائیوں کے ساتھ ایک عمل بھی کرے گا تاکہ دوائی تیزی سے اثر کرے۔ اُس نے مقتولہ پر اثر ڈالنے کے لئے مزید فیس مانگی جو مقتولہ

نے دے دی۔

اسی روز اس نے مقتولہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر نسخے کے الفاظ پڑھے اور مقتولہ کی آنکھوں میں پھونکیں ماریں۔ مقتولہ خوش ہوتی ہو گی کہ اب اس کا خاوند صحت یاب ہو جائے گا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اُس کی اپنی عمر چالیس روز رہ گئی ہے۔ وہ ہر روز آنے لگی اور حکیم اس پر اپنا عمل کرتا رہا۔ اس کا شاگرد جس نے شراب کے نشے میں حکیم کی نشاندہی کی تھی اس کا یتیم بھتیجا تھا۔ اسے اس عمل کا علم تھا۔ نسخے میں اور بھی بہت سے اجزا لکھے ہوئے تھے۔ وہ اس کا بھتیجا تلاش کرتا رہا۔ مجھے یہ اجزا یاد نہیں رہے۔ صرف کچھوے کی چربی یاد رہ گئی ہے جس کا حصول محال تھا لیکن عمل کے دسویں بارہویں روز بھتیجے نے بہت دور سے کچھوا حاصل کر لیا۔ اس کی چربی نکال لی۔

مقتولہ نے کھوپڑی نکالی

چالیسویں روز حکیم نے مقتولہ سے کہا۔ "مجھے اشارہ ملا ہے کہ یہ عورت مُردے کی کھوپڑی لائے۔ اس سے ایک دوائی بنے گی جو اس کے خاوند کو تین دنوں میں تندرست کر دے گی۔"

مقتولہ ڈر گئی۔ یہ سوال بھی تھا کہ انسانی کھوپڑی کہاں سے ملے گی۔ حکیم نے قبرستان کے ساتھ وہ نشیبی جگہ دیکھی تھی جس کے عمودی کناروں میں انسانی ڈھانچے کھوپڑیوں سمیت پھنسے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

اُس نے مقتولہ سے کہا کہ اُسے اُس (مقتولہ) پر اتنا رحم آتا ہے کہ وہ کھوپڑی حاصل کرنے میں اُس کی مدد کرے گا لیکن مقتولہ کو ساتھ جانا پڑے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُس کا بھتیجا بھی ساتھ ہوگا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ مقتولہ تیار ہوگئی۔ اُسے کہا گیا کہ وہ اگلی رات تنہا کہ آجائے لیکن کسی کو یہ نہ بتائے کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ ورنہ چالیس روز کے عمل کا اثر زائل ہو جائے گا۔ مقتولہ وقت پر حکیم کے پاس آگئی۔

حکیم نے اُس پر کوئی مزید عمل کیا۔ نسخے کے مطابق اُسے کوئی دوائی کھلائی پھر اُسے دلیری دینے کے لئے شراب پلائی۔ قصبے کے لوگ جلدی سو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ حکیم کا مکان الگ تھلگ تھا۔ اُس نے مقتولہ کو ساتھ لیا اور قبرستان کو چل پڑا۔ اس کا بھتیجا کلہاڑی اور ایک سلاخ (کھوپڑی دیوار سے نکالنے کے لئے) اُٹھائے ان کے پیچھے گیا۔ وہ قبرستان میں پہنچے۔ نشیب میں اُترے۔ حکیم نے ماچس جلا کر مقتولہ کو کھوپڑی دکھائی اور ماچس بجھا کر سلاخ اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اسے کہا کہ اب ہاتھوں سے ٹٹول کر اور سلاخ کی نوک سے مٹی کھود کر کھوپڑی نکال لے۔ کھوپڑی اتنی اُونچی تھی کہ مقتولہ کھڑی ہو کر نکال سکتی تھی۔

اُس نے کھوپڑی نکال لی۔ حکیم کے بیان کے مطابق وہ اتنا خوش ہُوا جیسے اُسے خزانہ مل گیا ہو۔ اُس نے سلاخ کی نوک سے اندھیرے میں ہی کھوپڑی کے اندر سے مٹی نکالی اور اسے جھاڑ لیا۔ اب اس

کھوپڑی کو کھوپڑی نکالنے والی کے سر کے خون سے دھونا یا تر کرنا تھا۔ طے ہوا تھا کہ مقتولہ کے سر پر بھتیجا کلہاڑی مارے گا مگر وقت آیا تو بھتیجا گھبرا گیا۔ اُس نے کچھ کہے بغیر کھوپڑی حکیم کے ہاتھ سے لے لی اور کلہاڑی اُسے دے دی۔ مقتولہ کی موجودگی میں وہ اصل بات نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم سمجھ گیا۔ وہ بھتیجے کو پرے لے گیا اور اُسے کہا کہ یہ کام مشکل نہیں۔ پیچھے سے دو وار کرو اور کام ختم۔ بھتیجے نے پوری بزدلی دکھائی اور کہا کہ یہ کام اُس سے نہیں ہو گا۔ مقتولہ اُن سے ذرا دُور کھڑی تھی۔ حکیم نے اُس کے پیچھے جا کر پوری طاقت سے اُس کے سر پہ کلہاڑی ماری۔ مقتولہ نے چیخ ماری۔ حکیم نے کلہاڑی کھوپڑی سے نکالی۔ مقتولہ پیچھے کو گرنے لگی۔ حکیم نے ایک پاؤں اس کی کمر پر رکھ کر اسے سیدھا کیا اور کلہاڑی کا دوسرا وار کیا۔ مقتولہ کو اُس نے گرنے نہ دیا۔ اسے کمر سے پکڑ لیا اور اسے آگے کو جھکا دیا۔ بھتیجے سے کہا کہ کھوپڑی اس کے سر کے نیچے رکھو اور خون سے تر کر لو۔ مقتولہ تڑپ رہی تھی۔

بھتیجے نے مقتولہ کے سر سے گرتے ہوئے خون سے کھوپڑی بھگو لی اور بولا کافی ہے۔ اسے پھینک دو۔ حکیم نے مقتولہ کو پھینک دیا۔ وہ تھوڑی دیر تڑپتی رہی پھر اس کا جسم ساکن ہو گیا۔ بھتیجے کے منہ سے ایسی باتیں نکلیں جن سے حکیم کو شک ہوا کہ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ بھی کہا — "حکیم چچا! آپ نے دیکھا ہو گا کہ راستے میں دو آدمیوں نے ہمیں اس طرف آتے دیکھا تھا۔ کل صبح اس کی لاش دیکھ

کر وہ سب کو بتا دیں گے کہ اس عورت کو ہم نے مارا ہے"۔ اس نے ایسی کتنی اور باتیں کیں جن کا حکیم پر یہ اثر ہوا کہ وہ ان بے بنیاد باتوں کو سچ ماننے لگا اور اسے ایسا خطرہ نظر آنے لگا جیسے قبرستان میں کچھ لوگ چھپے ہوتے ان کے جرم کو دیکھ رہے ہوں۔

یہ دراصل وہ نفسیاتی اثر تھا جو قتل کے بعد قاتلوں پر طاری ہوا کرتا ہے۔ قتل کر دینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ قتل ہضم کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ انسانی جان لینا ایسا فعل ہے جسے کوئی عادی قاتل ہی برداشت کر سکتا ہے۔ اگر غور سے دیکھیں تو عادی قاتل بھی بڑے جتن کر کے اس بھیانک جرم کو ہضم کرتا ہے۔ حکیم کا بھتیجا تو تھا ہی بزدل، حکیم کو بھی اپنے ارد گرد خطرے منڈلاتے نظر آنے لگے۔ اس نے یہ خواب دیکھ کر یہ جرم کیا تھا کہ وہ دوائی تیار کر کے نوابوں، راجوں اور مہاراجوں سے خزانے سمیٹ لے گا اور وہ محل جیسے مکان میں رہے گا۔ قتل کا ارتکاب کر کے خوابوں کا محل پھانسی کی کوٹھڑی بن گیا۔ اُس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ دماغ جواب دے گیا۔ اس ذہنی اور جذباتی حالت میں حکیم جرم کو چھپانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

اُسے یاد آیا کہ مقتولہ اس کے ساتھ دل کی باتیں کیا کرتی تھی۔ حکیم اپنی ضرورت کے مطابق اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس نے حکیم کو بتایا تھا کہ ٹھاکر کا بیٹا اس کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ بدمعاش مزارعہ کا بھی مقتولہ نے حکیم کے ساتھ ذکر کیا تھا۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر

حکیم نے یہ فیصلہ کیا کہ لاش اُٹھا کر ٹھا کر کے باغیچے میں پھینک دی جائے۔ حکیم کو یہ شک بھی تھا کہ اس عورت کا چال چلن ٹھیک نہیں ہوگا۔ باغیچے کے مزارعے وغیرہ یہ کہیں گے کہ یہ عورت اپنی بدکاری کا شکار ہوئی ہے۔ حکیم کے بھتیجے نے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔

اُس نے لاش اپنے کندھوں پر ڈال لی اور چچا بھتیجا چل پڑے۔ نالے میں جا کر بھتیجے نے لاش چچا کے کندھوں پر رکھی اور کھوپڑی اُس نے اُٹھالی۔ وہ باغیچے کے باہر بینگنوں کے کھیت تک پہنچے اور لاش کیارے میں پھینک دی۔

صُبح سویرے حکیم نے دیکھا کہ خوف کے مارے بھتیجے کا حال بُرا ہو رہا تھا۔ حکیم نے نسخے کے تمام اجزا حاصل کر لئے تھے۔ آخری چیز کھوپڑی تھی۔ وہ بھی مِل گئی۔ اُس نے تمام اجزا اور کھوپڑی کنستر میں ڈالی اور عرق کشید کرنے لگا۔ بھتیجے کو دیکھا۔ اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ حکیم نے اُسے کہا کہ تھانے کے باہر جا کر کھڑے ہو جاؤ اور دیکھو کہ پولیس باغیچے میں جاتی ہے یا نہیں۔ اگر پولیس کسی کی رپورٹ پر وہاں جائے تو دُور کھڑے ہو کر دیکھتے رہنا کہ پولیس کیا کرتی ہے۔ حکیم نے بتایا کہ شام کے بعد تک وہ دوائی بنانے میں اتنا مگن رہا کہ اُسے یاد ہی نہ رہا کہ اُس کا بھتیجا صُبح سے باہر گیا ہُوا ہے۔ دروازے پر دستک ہُوئی تو اُس نے اس امید پہ دروازہ کھولا کہ بھتیجا آیا ہے مگر وہ میں تھا۔

دوسرے دن بھتیجے نے بھی اقبالِ جُرم کر لیا جو حکیم کے اقبالی بیان

کی تصدیق کرتا تھا۔ دونوں نے مجسٹریٹ کو اقبالی بیان قلمبند کروا دیئے۔ میں نے ان پر بھروسہ کیا۔ شہادت مکمل کر لی۔ عدالت میں دونوں اپنے بیانوں پر قائم رہے۔ حکیم نے قتل کا الزام اپنے سر لیا تھا۔ انگریز سیشن جج نے خاصا لمبا فیصلہ لکھا تھا۔ اُس نے حکیم کو سزائے موت اور اس کے بھتیجے کو اعانتِ جرم میں سات سال سزائے قید دی تھی۔ جج کے فیصلے کے دو چار فقرے مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ اُس نے لکھا تھا کہ اس مقدمے کی سماعت کے دوران میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں افریقہ کے وسطی جنگلوں میں بیٹھا ہوں جہاں انسان انسان کا گوشت کھاتا ہے اور جہاں اس قسم کے ٹونے ٹوٹکے رائج ہیں۔ آگے چل کر اُس نے لکھا کہ اسلام اور ہندومت دو متضاد مذہب ہیں لیکن توہم پرستی اور ٹونے ٹوٹکوں میں ہندوستان میں مسلمان اور ہندو ایک ہی ڈگر پہ چلتے نظر آتے ہیں۔

کتاب کا کور

عامر بلال

رابطہ

فیس بک

https://www.facebook.com/aamiralibilal

ٹویٹر

http://twitter.com/aamirbilal

انسٹاگرام

https://www.instagram.com/aamirbilal

یوٹیوب

https://www.youtube.com/@aamirbilal

جنّات کے دربار میں

جرم چھوٹا ہو یا بڑا، ہوتا گناہ ہے لیکن اپنے آپ کو یہ تسلی دے کر جرم کرنا کہ کوئی پکڑ نہیں سکے گا، بہت بڑی حماقت ہے۔ جرم سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا خواہ مجرم خزانے لوٹ کر لے جائے۔ آج کل کی بات کچھ اور ہے۔ مجرموں کو پشت پناہی حاصل ہے اور یہ ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ جرم کروگے تو وارے نیارے ہو جائیں گے، لیکن مجرمانہ زندگی کو پسند کرنے والے لوگوں کو یہ احساس نہیں رہا کہ دنیا کے یا اپنے ملک کے قانون کو کسی کے ساتھ مل کر دھوکہ دیا جا سکتا ہے، خدائی قانون کی اندھی اور بے آواز لاٹھی کو نہیں روکا جا سکتا جرم خواہ چند روپوں کی رشوت خوری ہو یا دکانداری میں چھوٹا سا جھوٹ ہی کیوں نہ بولا جائے، سزا ضرور ملتی ہے۔

میں نے حماقت کا ذکر کیا ہے۔ میری اس کہانی کے مجرموں کو بھی یہی امید تھی کہ جرم کا سراغ پولیس کو ملے گا ہی نہیں۔ وہ یہ امید

بھی رکھ سکتے تھے کہ مجھے قتل کرا دیں گے یا مجھے نوکری سے برطرف کرا دیں گے۔ انہیں بہت طاقت حاصل تھی لیکن خدا میری طرف تھا۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب انگریزوں کو پکی امید تھی کہ وہ ہندوستان کے تاحیات تاجدار رہیں گے۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئے دو تین مہینے گزر گئے تھے۔ سورج طلوع ہونے والا تھا جب میرے تھانے کے ایک گاؤں کا ایک مسلمان زمیندار تھانے میں یہ رپورٹ لے کر آیا کہ اُس کی گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ مویشی اور گھوڑے چوری ہوتے ہی رہتے تھے جو ہمارے لئے اس وجہ سے مصیبت کا باعث بن جاتے تھے کہ لوگ چوری کے تین چار روز بعد تھانے میں رپورٹ درج کرانے آیا کرتے تھے۔ اس عرصے میں مسروقہ مویشی کے مالک اپنے طور پر سراغرسانی کرتے رہتے تھے۔ رپورٹ جب تھانے میں آتی تھی تو مسروقہ مویشی ملک کے دوسرے سرے تک پہنچ چکے ہوتے تھے۔ ہمارے لئے کوئی کھرا کھوج رہتا ہی نہیں تھا اس لئے تفتیش ناممکن ہو جاتی تھی۔ میں نے تمام نمبرداروں اور چوکیداروں کے ذریعے اپنے تھانے کے علاقے میں اعلان کرا دیا تھا کہ کسی کا کوئی مال مویشی چوری ہو جائے تو اپنی سراغرسانی کی بجائے فوراً تھانے میں آئے ورنہ میں رپورٹ درج نہیں کروں گا۔ اسی اعلان کا اثر تھا کہ اس مسلمان زمیندار کو صبح پتہ چلا کہ اُس کی گھوڑی غائب ہے تو وہ سورج نکلنے سے پہلے میرے پاس آ گیا۔ وہ اتنا امیر آدمی تھا کہ دس گھوڑیاں

بیک وقت خرید سکتا تھا لیکن جو گھوڑی لاپتہ ہو گئی تھی اُس جیسی گھوڑی ملنی محال تھی۔ یہ اعلیٰ نسل کی سدھائی ہوئی گھوڑی تھی۔ قدموں کی بہت تیز، نیزہ بازی کی ماہر اور ڈھول کی تھاپ پر ناچتی بھی تھی۔ اس مسلمان زمیندار کو یہ گھوڑی اس لئے بھی عزیز تھی کہ یہ اُس کے باپ کی نشانی تھی۔ کوئی ایک ہی سال ہوا اُس کا باپ مر گیا تھا۔ اب باپ کی گدی اور گھوڑی اس زمیندار کے پاس تھی۔ اُس کی عمر تیس سال سے ڈیڑھ دو سال اُوپر تھی۔

یہ کوئی خوبرو اور وجیہہ آدمی نہیں تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور قد کاٹھ ایسا ویسا ہی تھا۔ خدا نے اپنی زمین کا بہت سا حصہ اُس کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔ اس کے باپ دادا نے انگریزوں کی بہت خدمت کی اور غلامی میں نام پیدا کیا تھا جس کے صلے میں انگریزوں نے اس خاندان کو زرخیز اراضی اور دربار میں کرسی عطا کی تھی۔ اس خاندان کی فوجی خدمات صفر کے برابر تھیں۔ ان کی خدمت کا طریقہ مخبری تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے شروع ہوا تھا۔ اس خاندان کے بزرگوں نے انگریزوں کے "باغی سپاہیوں" کی نشاندہیاں کیں اور ان مجاہدینِ آزادی کو سزائیں دلوائی تھیں۔ اب انگریزوں کے اس انعام و اکرام کا وارث یہ جوان زمیندار تھا جس میں یہی ایک کشش تھی کہ وہ جاگیر کا شہزادہ تھا۔ دو گھوڑا بوسکی کے کپڑے پہنتا اور اعلیٰ نسل کی گھوڑی پر سواری کرتا تھا۔ وہ تھانے میں آیا۔ مجھے گھر سے بلایا گیا۔ اُس کا ایک نوکر اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے اپنی گھوڑی کی چوری کی رپورٹ

ایسے لہجے میں مجھے دی جیسے اپنے کسی نوکر کو حکم دے رہا ہو کہ ابھی جاؤ اور میری گھوڑی واپس لے آؤ۔ میں اُس سے اپنے مطلب کی باتیں پوچھنے لگا۔ اُس کی گھوڑی صحن میں بندھی ہوتی تھی۔ ہر رات وہیں باندھی جاتی تھی لیکن اُس روز علی الصبح گھوڑی وہاں نہیں تھی۔ یہ زمیندار جس حویلی میں رہتا تھا اس کے ساتھ مویشیوں کا مکان تھا۔ اس کا صحن اور دو فراخ کمرے تھے۔ ایک نوکر صحن میں سوتا تھا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند ہوتا تھا۔ یہ نوکر اُس کے ساتھ تھانے میں آیا تھا۔ نوکر نے بتایا کہ سحر کی تاریکی میں اُسے بھینسیں دوہنے والے نوکر نے جگایا۔ اس سے پہلے وہ دروازہ کھٹکھٹایا کرتا اور نوکر اندر سے دروازہ کھولا کرتا تھا لیکن اُس روز نوکر نے اُسے اندر آکر جگایا تو اُس نے جگانے والے سے پوچھا کہ دروازہ کس نے کھولا ہے؟ اُسے دوسرے نوکر نے بتایا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تب اس نے دیکھا کہ گھوڑی غائب ہے۔

اِدھر اُدھر دیکھا۔ گھوڑی نہ ملی۔ بھینسوں والے نوکر نے اُسے مشورہ دیا کہ مالک کو بتا دیا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ زمیندار کو جگا کر بتایا گیا۔ اُس نے آکر دیکھا۔ پہلے تو نوکر کی پٹائی کی پھر اُسے تھانے چلنے کو کہا۔ نوکر کو اچھی طرح یاد تھا کہ اُس نے رات دروازہ اندر سے بند کیا تھا۔ زمیندار کو یقین ہو گیا کہ گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ اُس نے مجھے گھوڑی کی وہ خوبیاں بتائیں جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُسے کسی پر شک نہیں۔ اُس نے گھوڑی کا رنگ بھی بتایا۔ اُس

نے یہ بھی کہا کہ وہ خود بھی گھوڑی تلاش کرے گا۔ اُس نے کہا۔ "رپورٹ درج کرانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں گھوڑی خود تلاش کر نہ لوں تو آپ چور کو گرفتار کر کے سزا دلا سکیں گے۔"

میں نے رپورٹ لکھ لی۔ مجھے جن معلومات کی ضرورت تھی وہ اُس سے اور اُس کے نوکر سے لے لیں اور اپنے اے۔ ایس۔ آئی عثمان کو کچھ ہدایات دے کر اور یہ کہہ کر راستے کھوجی کو گھر سے ساتھ لیتا جائے تفتیش کے لئے زمیندار کے ساتھ بھیج دیا۔ جانے سے پہلے زمیندار نے مجھے بتایا کہ اُس نے مویشیوں والے مکان کے باہر پہرہ بٹھا دیا تھا تاکہ کوئی اندر نہ جاتے۔ یہ اُس نے چور کا کھُرا (پاؤں کے نشان) محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔ اُس نے اپنے مکان تک آنے جانے والے راستوں پر بھی آدمی کھڑے کر دیتے تھے کہ ادھر سے کوئی نہ گزرے۔ میں نے اُس کی عقل کی تعریف کی اور میں نے اُس کے اس اقدام کی بھی تعریف کی کہ وہ وقت ضائع کئے بغیر میرے پاس آگیا تھا۔ لوگ نقب یا تالے کے موقعہ واردات پر پولیس کے آنے سے پہلے تماشہ دیکھنے کو ٹوٹ پڑتے ہیں اور مجرموں کے کھُرے تباہ کر دیتے ہیں۔

عثمان دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر اُس کے ساتھ چلا گیا۔ زمیندار کا گاؤں تقریباً دو میل دُور تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں غسل اور ناشتے وغیرہ کے لئے گھر چلا گیا۔ ایک گھوڑی کی چوری میرے لئے کوئی ایسی پیچیدہ اور اہم واردات نہیں تھی کہ میرا ذہن اس میں اُلجھ جاتا۔ مویشی

چوری ہوتے ہی رہتے تھے۔ میں نے اس گھوڑی کی چوری کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی کہ اس زمیندار کو ایک گھوڑی ضائع ہو جانے کا افسوس نہیں، اسے دراصل اس بات پر غصہ ہے کہ وہ اپنے علاقے کا بادشاہ ہے اور کوئی اس کی گھوڑی لے گیا ہے۔ میں جب غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر اور وردی پہن کر تھانے میں آیا تو مجھے کسی کام کے لئے عثمان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تب مجھے خیال آیا کہ اسے تو میں نے ایک گھوڑی کی چوری کی تحقیقات کے لئے بھیجا ہے۔ یہ واردات میرے لئے اتنی معمولی تھی کہ ایک گھنٹے بعد میرے ذہن سے اتر گئی مگر یہ چھوٹی سی واردات تفتیش کے دوران جرم و جاسوسی کا ایسا خطرناک ڈرامہ بن گئی جو مجھے اور عثمان کو موت کے منہ میں لے گئی۔

عورت کہاں سے آگئی؟

بارہ بجے کے قریب ایک کانسٹیبل جو عثمان کے ساتھ گیا تھا واپس آگیا۔ اس نے کہا کہ مجھے عثمان گاؤں میں بلاتا ہے۔ کانسٹیبل نے بلانے کی وجہ بتائی تو میں نے چار کانسٹیبل ساتھ لئے اور کانسٹیبل کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ گھوڑی کے مالک نے صحن میں اور باہر کھُرے رکھنے کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ راما کھوجی عثمان کے ساتھ اندر گیا۔ اس نے گھوڑی کا کھُرا پہچانا۔

انسانی کھُروں میں اُس نے نوکر کا کھُرا پہچانا اور ان میں اُس نے چور کا کھُرا دیکھا۔ یہ دیہاتی جوتی کا کھُرا تھا۔

میں نے اپنی کہانیوں میں آپ کو کئی بار بتایا ہے کہ مجرموں کے پاؤں کے نشان پہچاننا ایک مشکل فن ہے۔ اسے فن کی بجائے سائنس کہا جائے تو صحیح ہے۔ اسے کھُرا اُٹھانا کہتے ہیں۔ کھوجی کھُرے کو پہچان لیتا ہے۔ اس کھُرے کا اگر کہیں ذرا سا نشان (ایڑی کا یا صرف پنجے کا) نظر آجائے تو کھوجی پہچان لیتا ہے۔ یہ کھوجی ان پڑھ دیہاتی ہوتے ہیں۔ کھُرا اُٹھاتے اُٹھاتے کہیں کھُرا گم ہو جائے تو آخری پاؤں کے نشان کی سمت دیکھ کر وہ دُور آگے، کہیں نہ کہیں، یہ کھُرا دیکھ لیتے اور اکثر چور کے گھر یا جہاں کہیں وہ گیا ہو پہنچ جاتے ہیں۔ راما کھوجی اُس وقت پچاس سال کی عمر کا ماہر کھوجی تھا۔ اُس نے گھوڑی اور چور کا کھُرا اُٹھایا اور گاؤں سے باہر ایک جگہ رُک کر اُس نے زمین کو غور سے دیکھا اور عثمان کو بتایا کہ گھوڑی کے ساتھ ایک آدمی ہے جو گھوڑی سے آگے چلتا آیا ہے۔ یہاں ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ گھوڑی رُکی اور ان دونو میں سے ایک آدمی گھوڑی پر سوار ہو گیا ہے۔

اُس نے اس سے آگے کھُرا اُٹھایا۔ اُس کے کہنے کے مطابق گھوڑی پر ایک آدمی سوار تھا اور دوسرا آدمی اُس کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ گھوڑی پر زین نہیں ہو سکتی تھی۔ زمیندار نے میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ زین اُس کے گھر میں رکھی تھی۔ گاؤں سے تقریباً دو فرلانگ دُور

سے گھوڑی اور ایک آدمی کے کھُرے ایک جگہ جا کر رُک گئے۔ کھوجی نے زمین پر بیٹھ کر زمین سے بھید لیا اور بتایا ــــ "جو آدمی گھوڑی پر سوار تھا گھوڑی سے اُتر آیا ہے اور یہاں ایک اور کھُرا شامل ہو گیا ہے جو عورت کا ہے۔ یہاں عورت گھوڑی پر سوار ہو گئی ہے"۔ پھر وہ دیکھنے لگا کہ عورت کدھر سے آتی ہے۔

وہاں سے ڈیڑھ ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک آبادی تھی۔ واردات والے گاؤں سے اس آبادی کا فاصلہ دو فرلانگ کے لگ بھگ تھا۔ یہ اس علاقے کے پیر صاحب کی آبادی تھی۔ اس پیر کو لوگ پیر حکیم صاحب کہتے تھے کیونکہ وہ تعویذوں اور دعاؤں کے ساتھ دوائیں بھی دیا کرتا تھا۔ مُسلمان اُس سے تعویذ اور دعائیں لیتے، ہندو اور سکھ اس سے دوائیں لیتے تھے۔ یہ پیر حکیم صاحب "بے اولاد عورتوں کو اولاد" دیتا اور مشہور تھا کہ اُس کا دادا مُردے میں جان ڈال دیا کرتا تھا۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ یہ پیر (اولاد دینے والے ہر پیر کی طرح) بے اولاد صرف عورت ذات کو سمجھتا تھا خاوند کو نہیں۔ لہٰذہ صرف عورت کو اپنے پاس بُلاتا تھا۔ اُس کی شہرت دُور دُور تک تھی۔ ہندو اور سکھ عورتیں بھی اُس کے پاس تعویذ وغیرہ لینے جایا کرتی تھیں۔ چالیس کے لگ بھگ اُس کی عمر تھی۔ اُس کی زبان میں جادو تھا۔ اس چھوٹی سی بستی میں اُس کے باپ دادا کا مزار تھا۔ اس کے ساتھ اُس کا مکان تھا۔ اس کے ساتھ نو دس کچے مکان تھے جو اُس کے خصوصی مریدوں

اور نوکروں چاکروں کے تھے۔ مزار کے ارد گرد باغیچہ تھا۔

رلّے کھوجی نے عورت کا کھُرا اُٹھایا۔ وہ اس بستی ہی سے آرہی تھی۔ وہ جگہ جہاں گھوڑی رُکی، اس سے سوار اُترا اور اس پر ایک عورت سوار ہوئی تھی پیر حکیم صاحب کے مکان کے پچھواڑے کی طرف تھی۔ عورت کا کھُرا پیر کے مکان کے پچھواڑے تک چلا گیا۔ تماشائی اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہیں دُور ہٹا دیا گیا۔ کھُرا پچھواڑے کی دیوار کے ساتھ سے شروع ہُوا تھا۔ کھوجی نے دیوار کو غور سے دیکھا۔ دیوار پر رگڑ کے نشان تھے۔ اُس نے کہا۔ "عورت اُوپر سے یعنی چھت سے نیچے آئی ہے۔ نیچے آنے کا ذریعہ رسّہ ہو سکتا ہے" لیکن وہاں کوئی رسّہ نہیں لٹک رہا تھا۔ اُتار لیا گیا ہو گا۔ میں نے جا کر وہ جگہ دیکھی تو میری بھی یہی رائے تھی کہ رسّہ اُوپر باندھ کر لٹکایا گیا اور عورت رسّے کو پکڑ کر اور پاؤں دیوار پر رکھتی نیچے آئی۔ جہاں وہ زمین پہ آئی وہاں اس کے کھُرے صاف بتاتے تھے کہ اس کا مُنہ پہلے دیوار کی طرف تھا، پھر وہ پیچھے کو مُڑی اور چل پڑی۔ اُس کے کھُرے اُس جگہ تک گئے جہاں گھوڑی رُکی تھی۔ وہاں سے کھُرے غائب ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عورت گھوڑی پہ سوار ہو گئی اور گھوڑی اُسے نامعلوم منزل کو لے گئی۔ وہاں سے گھوڑی کے کھُروں کے ساتھ دو آدمیوں کے کھُرے شروع ہُوئے۔ صاف ظاہر تھا کہ عورت پیر حکیم صاحب کے گھر سے فرار ہوئی ہے۔ لہٰذا اس کے گھر کے افراد کو شاملِ تفتیش کرنا ضروری تھا۔

مجھے اس عورت کے بھاگ جانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے تھی کیونکہ میرے پاس اس کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں آئی تھی۔ میری دلچسپی گھوڑی کے ساتھ تھی۔ اتفاق سے (یا مجرموں کے پروگرام کے مطابق) عورت کے کھرے گھوڑی سے جا ملے تو میرے لئے ضروری ہو گیا کہ معلوم کروں کہ یہ عورت کون تھی اور کس کے ساتھ گئی ہے۔ کسی پیر کے گھر سے کسی عورت کا فرار میرے لئے ایسا واقعہ نہیں تھا کہ میں حیران ہوتا یا میں چونک اٹھتا۔ ان پیروں کی اندرونی دنیا پُر اسرار ہوتی ہے۔ انہی اسرار کو لوگ مرشد کی کرامات کہتے ہیں مگر یہ جرائم اور گناہوں کی دنیا ہے جسے کسی روشن خیال پولیس افسر کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پیروں کے گھروں میں کسی عورت کی قید اور فرار کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہوتا۔ یہ پیر حکیم صاحب "اولاد دینے والا" پیر تھا۔ اس نے کسی بے اولاد عورت کو اولاد کا جھانسہ دے کر گھر میں رکھ لیا ہوگا اور وہ موقعہ پا کر نکل بھاگی ہوگی۔

"لیکن وہ زمیندار کی گھوڑی پر کیوں گئی؟" میں نے سوچا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ زمیندار نے ہی اس عورت کو فرار کرایا ہو.... اگر ایسا ہی تھا تو اس نے گھوڑی کی چوری کی رپورٹ کیوں دی؟ اس کے کہنے کے مطابق، گھوڑی زین کے بغیر گئی تھی۔

عثمان ایک ذہین پولیس افسر تھا۔ اس واردات میں اس نے یقیناً کوئی اہم بات معلوم کی ہوگی۔ اسی لیے اس نے مجھے بلا لیا تھا۔

عورت رسّے سے اُتری تھی

میں کانسٹیبل کے ساتھ اُس جگہ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ مجھے کھُرا اٹھانے اور کھُرا پیر حکیم صاحب کے پچھواڑے سے پہنچنے تک کی روداد سُنا رہا تھا.... ہم دونوں پیر کی بستی تک پہنچ گئے۔ عثمان غصے اور تذبذب کی حالت میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ عثمان کے متعلق میں نے آپ کو پہلے کسی کہانی میں بتایا تھا کہ رام پور کے اعلیٰ خاندان کا جوان اور خوبرو آدمی تھا۔ جسم پھرتیلا اور وہ زندہ دل تھا۔ جس کیس میں کوئی خوبصورت اور شوخ لڑکی شامل ہو اُس کیس کی تفتیش وہ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اُسے رشوت سے نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ وہ امیر خاندان کا فرد تھا۔ اُس کا باپ اُسے پولیس کا بہت بڑا افسر بنانا چاہتا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو پولیس کا سب سے بڑا افسر بنتا۔ اُس میں تمام خوبیاں اور اہلیت موجود تھی لیکن میرے لیئے اُس نے اپنی جان قربان کر دی۔ میں ابھی تک ہر سال اُس کے یومِ وفات پر اُس کے لیئے درُود اور فاتحہ پڑھا کرتا ہوں۔

وہ پیر حکیم صاحب کی بستی سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ کھوجی، ایک کانسٹیبل اور گھوڑی کا مالک زمیندار اُس کے پاس کھڑے تھے۔ تفتیش رُکی ہوئی تھی۔ عثمان نے مجھے کھُروں کی وہی تفصیل سُنائی جو کانسٹیبل مجھے

راستے میں سُنا چکا تھا۔ میں نے پیر کے مکان کے پچھواڑے ہماکر زمین پر عورت کے کھُرے دیکھے۔ دیوار پر جوتیوں کی رگڑ کے نشان دیکھے۔ اس میں کوئی شک نہ رہا کہ زمین پر کھُرے عورت کے ہیں۔ عثمان مجھے بلانے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اُس نے پیر کے خصوصی مریدوں یا درباریوں میں سے کسی سے کہا کہ وہ پیر صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ عثمان کو بتایا گیا کہ پیر صاحب رات کو گھر میں ہی تھے، صبح سویرے کہیں چلے گئے ہیں۔

"میں اُوپر جاؤں گا" — عثمان نے اس آدمی سے کہا — "گھر والوں سے کہو کہ پردہ کر لیں۔"

"مجھے گناہگار نہ کریں" — پیر حکیم صاحب کے اس درباری یا نوکر نے عثمان سے کہا — "سرکار (پیر صاحب) کی غیر حاضری میں فرشتے اور جنات بھی اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

عثمان بھی جنات کی نسل سے تھا۔ اُس نے غصے سے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک نوکرانی نکلی۔ عثمان نے اُسے کہا کہ اندر پردہ کراؤ، میں اُوپر جاؤں گا۔ نوکرانی اندر چلی گئی اور اندر سے وہی جواب لائی جو عثمان کو پیر کا ایک آدمی دے چکا تھا۔ اتنے میں "سرکار کے دربار" کے چند اور آدمی آ گئے۔ انہوں نے عثمان کو اس درگاہ اور سرکار کے قہر سے ڈرایا اور مشورہ دیا "سرکار کو آنے دیں" — عثمان وقت ضائع کرنے کے نقصان سے آگاہ تھا اور وہ "سرکار" سے ڈرنے والا

آدمی بھی نہیں تھا، لیکن وہ اندر کی مستورات کے خیال سے اندر نہ گیا اور مجھے بلا لیا۔ میں ان "سرکاروں" کے معاملے میں پورا کافر تھا۔ وہاں زمیندار موجود تھا جو سرکاری طور پر سفید پوش تھا۔ نمبردار اور چوکیدار کو بھی بلا لیا اور یہ دروازہ کھلوا کر اندر چلا گیا۔

مجھے احساس تھا کہ ایک پیر کے گھر میں زبردستی داخل ہونے کا نتیجہ کیا ہو گا۔ بڑے بڑے جاگیردار اور انگریزوں کے پروردہ سرکردہ مسلمان بھی اس پیر کے مرید تھے۔ یہ سب میرے خلاف طوفان کھڑا کر سکتے تھے۔ انگریز افسروں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ وہ کسی کے مذہب، عبادت گاہوں اور توہمات، پنڈتوں، پیروں وغیرہ میں دخل اندازی نہیں کرتے کرتے تھے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہ ہندوستانیوں کے مذہبوں اور مذہبی پیشواؤں کا احترام کرتے تھے۔ وہ دراصل اس دکھاوے کے احترام سے مذہبی پیشواؤں کی حمایت حاصل کئے رکھتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کے پیر اور ہندوؤں کے سادھو اور ان کے لوٹنے لٹانے فراڈ کے سوا کچھ بھی نہیں اور ان کا کاروبار صرف اس لئے چمک رہا ہے کہ لوگ جاہل اور پسماندہ ہیں۔ اسی لحاظ سے انگریز ہندوستان کے دیہاتیوں کو افریقہ کے حبشیوں سے تشبیہہ دیا کرتے تھے۔

مجھے احساس تھا کہ میں پیر کی غیر حاضری میں اس کے گھر میں داخل ہو کر غلطی کر رہا ہوں اور فرض کی ادائیگی مجھے کسی مصیبت میں ڈال سکتی

ہے مگر میری طبیعت کے اکھڑپن اور ضدی پن نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ یہ وجہ بھی تھی کہ میں پیری مُریدی کے خلاف تھا۔ میں قرآن اور رسولِ خدا کا مرید ہوں۔ میں چار کانسٹیبل اس لئے اپنے ساتھ لایا تھا کہ کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی تھی۔ ہندو عموماً میرے خلاف ہو جایا کرتے تھے اور میں ان کا مقابلہ بھی کیا کرتا تھا مگر اپنے مسلمان پیر پرست بھائیوں پر مجھے ذرہ بھر بھروسہ نہیں تھا۔ بہرحال میں نے خطرہ مول لیا۔ سیڑھیوں سے اُوپر گیا۔ چھت مٹی والی تھی۔ لیپ پرانا تھا۔ کھوجی نے وہاں بھی عورت کا کھرا ڈھونڈ لیا۔ منڈیر پر رسّے کا نشان معلوم ہوتا تھا۔ وہاں منڈیر سے ہٹ کر ایک ممٹی تھی۔ رسّے کا اوپر والا سرا وہاں باندھا گیا ہوگا۔

میں نے اور کھوجی نے چھت اور منڈیر پر نشان دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ یقین ہو چکا تھا کہ اُوپر سے کوئی نیچے گیا ہے۔ اسے کھوجی عورت کہہ رہا تھا۔ میں نے پیر حکیم صاحب کے درباری مریدوں اور نوکروں میں سے چار کا انتخاب کیا اور انہیں دو کانسٹیبلوں کے ساتھ تھانے بھیج دیا۔ میں نے گھر کی مستورات سے بات کرنے کی جرأت نہ کی۔ کھوجی کو میں اُس جگہ لے گیا جہاں اُس کے بتانے کے مطابق گھوڑی رُکی اور اُس پر لڑکی سوار ہوئی تھی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ کھُرے صاف ہیں اور وہ آگے جائے گا۔ میں نے اُسے کہا کہ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لو اور جہاں تک کھُرا ملتا ہے جاؤ۔ جو دو کانسٹیبل عثمان کے ساتھ آئے تھے اُن میں ایک اشرف علی تھا۔ اُس نے کہا ”میں راستے کے ساتھ

جاؤں گا۔"

"ملک صاحب! اسی کو رامے کے ساتھ جانے دیں"۔۔۔ عثمان نے ہنس کر کہا۔۔۔ "یہ تھانیداری کی امید لگائے بیٹھا ہے۔ میں نے تھانے سے چلتے وقت دو کانسٹیبلوں کو بلایا تو یہ دوڑا آیا اور بولا، میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ اسے تفتیش کی پریکٹس کرنے دیں۔"

گھوڑی غائب ہوئی یا عورت؟

اشرف علی رامے کھوجی کے ساتھ ہو گیا اور میں تھانے کو چل پڑا۔ زمیندار نے مجھ سے پوچھنے کی بجائے مجھے کہا۔۔۔ "میں گھر جا رہا ہوں۔ گھوڑی کا کچھ پتہ چلے تو مجھے بلا لینا۔"

"جناب!" ۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "آپ کو میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ مجھے ابھی آپ کی ضرورت ہے۔"

وہ بادلِ نخواستہ میرے ساتھ چل پڑا۔ مجھے کچھ ایسا شک ہونے لگا تھا کہ پیر کے گھر سے عورت اسی نے فرار یا اغوا کرائی ہے اور اُسے اپنی گھوڑی پر کہیں بھیج دیا ہے۔ اس نے اتنی سویرے گھوڑی کی رپورٹ دے دی تھی۔ اس میں کوئی راز تھا۔ اس نے کوئی ڈرامہ بنایا ہو گا۔ میرا شک غلط ہو سکتا تھا۔ میرے سامنے ایک اور پس منظر بھی تھا۔ وہ یہ کہ علاقے کے پیر اور علاقے کے جاگیردار کی آپس میں

اکثر عداوت ہوا کرتی ہے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ زیادہ تر پیر سے متاثر ہوتے اور اُسی کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ جاگیردار یا بڑا زمیندار غریب کسانوں کو اپنی رعایا سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر جاگیردار پیروں کی اصلیت سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان کی بدکاریوں کو بھی جانتے ہیں۔ بعض اوقات جاگیردار کی منظورِ نظر پر پیر کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اُن کی درپردہ عداوت چلتی رہتی ہے۔

اس بنا پر مجھے شک ہوا کہ پیر حکیم صاحب اور اس زمیندار کی عداوت ہوگی اور اس عداوت کی وجہ یہ عورت ہو سکتی ہے جو پیر کے گھر سے فرار ہوتی یا فرار کرائی گئی ہے اور گھوڑی چوری نہیں ہوئی بلکہ اُس نے خود کھلوائی ہے اور یہ اس ڈرامے کی ایک جعلی کڑی ہے ....

تھانے جا کر میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ عورت کون ہو سکتی ہے جو پیر کے گھر سے گئی ہے؟

"اُس کے گھر میں عورتوں کی کمی تو نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ کون سی بھاگی ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اُس کے ہاں عورتیں اولاد کی مُراد لے کے جاتی رہتی ہیں؟ ان میں سے کسی کو اُس نے گھر میں روک لیا ہوگا اور وہ بھاگ نکلی ہوگی"۔

"آپ اس کے مُرید نہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"میں ایسے نوسر باز اور بدکار کا مُرید نہیں بنوں گا" — اُس نے کہا۔

اُس کے اِس جواب سے یہ پتہ چل گیا کہ ان کی عداوت ہے۔ مَیں نے عداوت کی وجہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی۔ پھیر پھیر کر سوال کیے لیکن اُس سے میرے مطلب کی کوئی بات معلوم نہ ہوئی، سوائے اس کے کہ اُس کے دل میں پیر کی عداوت ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ گھوڑی پیر نے چوری کروائی ہوگی۔ اُس نے کہا — "اُسے آپ تھانے بلوا کر نہیں پُوچھ سکتے؟" — وہ چاہتا تھا کہ پیر کو مشتبہ کی حیثیت سے تھانے بلوایا جاتے۔

مویشیوں کی چوری کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ پیسہ کمانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ چوری کے مویشی خریدنے والے مجرم قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ دیہات میں مویشی، خصوصاً کسی کا گھوڑا چوری کرنے یا کرانے کی ایک وجہ دشمنی بھی ہوتی ہے۔ دیرینہ دشمنی کی بنا پر ایک دوسرے کے کھلیان جلا دیتے جاتے ہیں اور مویشی چوری کر کے غائب کر دیتے جاتے ہیں۔ اُس دور میں یہ بھی ہوتا تھا کہ گھوڑا گھوڑی یا کوئی اعلیٰ نسل کا مویشی چوری ہو جاتے تو اسے سخت بے عزتی سمجھا جاتا تھا۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ زمیندار کو بے عزت کرنے کے لئے اُس کی اچھی گھوڑی کھلوائی گئی، مگر کوئی بھی شک ذہن میں آتا تو اس مقام پر شک ہوا میں اُڑ جاتا جہاں گھوڑی کے کھُرے میں ایک عورت کا کھُرا شامل ہو گیا تھا اور یہ کھُرا چھت سے دیوار کے ساتھ نیچے آیا تھا۔ مجھے اس سے اطمینان ہوتا تھا کہ راما کھوجی اور کانسٹیبل اشرف علی کھُرا اُٹھانے

آ گے چلے گئے تھے۔

نیلی آنکھوں والی لڑکی — ایک بھید

پیر حکیم صاحب کے جن چار آدمیوں کو میں ساتھ لایا تھا انہیں باری باری اپنے دفتر میں بُلایا۔ زمیندار کو گھر جانے کی اجازت دے دی اور اُسے کہا کہ وہ اپنے ذرائع سے بھی گھوڑی کا کھوج لگانے کی کوشش کرے۔ پیر کے چار میں سے دو آدمیوں کو اندر کی باتوں کا کچھ بھی علم نہیں تھا۔ باقی دو میں سے ایک کو کچھ نہ کچھ معلوم تھا لیکن وہ ذرا سخت معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے پردہ پوشی کی کوشش کی۔ اُسے یہ خوش فہمی تھی کہ میں پیر کے تقدس اور رعب سے مرعوب ہو کر اُسے پریشان نہیں کروں گا۔ میں نے تھوڑی سی دیر میں اُس پر پولیس کا "تقدس" اور اپنا رعب طاری کر دیا۔ اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ میں کسی کو یہ نہ بتاؤں کہ اُس نے مجھے کچھ بتایا ہے۔

اُس نے بتایا کہ آٹھ دس دن گزرے ایک گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی لڑکی پیر کے ہاں آئی تھی۔ اس آدمی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔ اُس نے لڑکی کو پہلے روز ہی دیکھا تھا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ لڑکی گئی نہیں، پیر کے گھر میں ہی ہے۔ آٹھ دس روز بعد (وارادات کی صبح) یہ آدمی پیر کے نوکروں کے کمرے میں سویا ہوا تھا۔

اُسے بستی کے ایک آدمی نے جگا کر بتایا کہ پیر کے کمرے کے پچھواڑے سے ایک رسّہ لٹک رہا ہے۔ یہ آدمی دوڑتا گیا اور رسّہ لٹکتا دیکھا۔ صبح ابھی دھندلی تھی۔ اُس نے پیر کو اطلاع دی۔ پیر نے رسّہ اُتروا دیا۔ وہ سخت غصّے میں تھا۔ اُس نے گھوڑا تیار کرایا اور کہیں چلا گیا۔ اس آدمی کو پتہ چلا کہ گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی لڑکی بھاگ گئی ہے۔ اس آدمی نے مجھے بتایا کہ یہ آدمی جو باہر بیٹھا ہے بہت کچھ جانتا ہے۔ یہ پیر کا خاص آدمی تھا۔ میں نے چوتھے آدمی کو بلایا۔ اُس نے بھی مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے لپیٹ میں لے لیا۔ اُس نے یہاں تک رضامندی کا اظہار کر دیا کہ وہ اس کیس میں میرے لئے مخبری کرے گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ صحیح مخبری کرے گا تو اُسے معقول انعام ملے گا۔ اُس نے ایک گاؤں کا نام لے کر بتایا کہ لڑکی وہاں کی رہنے والی ہے اور غریب ماں باپ کی بیٹی ہے۔

”مگر میں مان نہیں سکتا کہ یہ لڑکی اُس ماں اور اس باپ کی بیٹی ہے“ — اُس نے کہا — ”ماں کا رنگ ذرا صاف گندمی ہے اور باپ کالے رنگ کا ہے۔ یہ غریب کسان ہیں۔ ان کی بیٹی گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی نہیں ہو سکتی۔ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ غریب آدمی اپنی بیوی کو سرکار (پیر) کے پاس اولاد کے لئے لایا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ لڑکی اس کی واحد اولاد ہے۔ اس کے بعد کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ سرکار اُسے تعویذ دیتے تھے۔ سات آٹھ روز

گزرے یہ میاں بیوی اس لڑکی کو ساتھ لاتے۔ سرکار نے دیکھ کر کہا کہ یہ لڑکی انسان نہیں جن ہے جس نے اس عورت کے بطن سے جنم لیا ہے۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ علیحدگی میں سرکار نے ان کے ساتھ کیا باتیں کیں۔ ماں باپ لڑکی کو یہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں سرکار کا خاص آدمی ہوں۔ ایک روز سرکار نے مجھے کہا کہ یہ لڑکی ان غریبوں کے گھر اچھی نہیں لگتی۔ اب یہ ہمارے دربار میں رہے گی کیونکہ یہ جنات کی نسل سے ہے۔۔۔۔

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میاں بیوی کسی اور کی بیٹی کو ورغلا کر یا اغوا کر کے سرکار کو خوش کرنے کے لئے لے آئے ہیں۔ یہ ان کی بیٹی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے سرکار سے نہیں پوچھا کہ لڑکی کی اصلیت کیا ہے۔ آج صبح سرکار نے مجھے غصے سے جگایا اور گالیاں دے کر کہا کہ وہ غائب ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بدبخت جن تھی ورنہ غائب نہ ہوتی۔ سرکار مجھے چھت پر لے گئے۔ وہاں ممٹی کے ساتھ رسہ بندھا ہوا تھا جو نیچے زمین تک چلا گیا تھا۔ لڑکی رسے سے ہی نیچے گئی ہو گی۔ بڑے دروازے سے وہ نہیں بھاگ سکتی تھی کیونکہ ڈیوڑھی میں، میں اور میرے دو ساتھی سوتے ہوتے ہیں۔ سرکار نے رسہ غائب کرا دیا اور مجھے سختی سے کہا کہ کسی کے ساتھ اس کا ذکر نہ ہو۔ پھر سرکار گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آ گئی۔"

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری دلچسپی لڑکی کے ساتھ نہیں گھوڑی کے ساتھ تھی کیونکہ میرے پاس رپورٹ گھوڑی کی چوری کی آئی تھی لڑکی

کی گمشدگی کی نہیں۔ رامے کھوجی نے مجھے اس چکر میں ڈال دیا تھا کہ پیر کی چھت سے ایک عورت اُتری اور چوری کی گھوڑی پر سوار ہوتی ہے۔ لہٰذا مجھے اس لڑکی کے متعلق سب کچھ معلوم کرنا پڑا۔ میں نے پیر کے اس خاص آدمی سے پوچھا کہ لڑکی زمیندار کی گھوڑی پر کیوں گئی ہے؟ — اُس نے کہا کہ اس کے متعلق اُسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ البتہ اُسے یہ معلوم ہے کہ زمیندار اور پیر کی عداوت چلی آرہی ہے۔ عداوت کی وجہ یہ ہے کہ پیر ایک لڑکی پر ہاتھ صاف کر گیا تھا جسے زمیندار اپنی زرخرید لونڈی سمجھتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ یہ لڑکی اونچی ذات کی مسلمان ہے اور اب کسی اور کی بیوی ہے۔

"پھر اِس نیلی آنکھوں والی لڑکی پر دونوں کی عداوت پہلے سے زیادہ ہوگئی" — اُس نے بتایا — "لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ زمیندار اس لڑکی کو کہاں ملا اور اُن کے تعلقات گھر سے ملتے تھے یا نہیں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ پیر نے لڑکی کو کہیں آگے چلا دیا ہو؟" میں نے پوچھا — "اور زمیندار کی گھوڑی چوری کروا کے لڑکی کو اُس پر بھیجا ہو؟"

"نہیں" — اُس نے وثوق کے ساتھ جواب دیا — "اگر سرکار ایسا کام کرواتے تو میرے ہاتھوں کرواتے۔ اگر کسی اور سے کرواتے تو میرے ساتھ ضرور بات کرتے۔"

"تم کیوں یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ پیر ہر معاملے میں تمہارے ساتھ بات

ضرور کرتا ہے؟

وہ عجیب طرح ہنسا اور بولا "کیسا پیر؟ کہاں کا پیر؟ لوگ اسے اس لیے سرکار کہتے ہیں کہ اسے خدا کا ایلچی سمجھتے ہیں، اور میں اسے اس لیے سرکار کہتا ہوں کہ نوسربازی کا اُستاد ہے اور میں اس کا شاگرد ہوں۔ اس نے میری عیش و عشرت کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس کے مکان میں تعویذوں کے ذریعے اولاد دینے کے پردے میں جو بدکاری ہوتی ہے اس کا عینی شاہد صرف میں ہوں۔ لوگ بے غیرت ہیں جو اپنی عورتوں اور جوان لڑکیوں کو اس شخص کے گھر بھیجتے ہیں۔ مُردے میں تو کبھی خُدا نے بھی جان نہیں ڈالی لیکن لوگ اس جھوٹ کو سچ مانتے ہیں کہ اس پیر کے باپ دادا مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ اگر حکومت اس شخص کو اس گھر سے نکال دے تو یہ کسی مسجد میں نہیں جا بیٹھے گا، نہ جنگل میں جاکر اللہ اللہ کرے گا بلکہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے جا ملے گا۔"

میں نے اس سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور اُس کے ساتھ مُخبری کا سودا کر کے اُسے اور اس کے ساتھیوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی عثمان کو بتایا کہ یہ آدمی مجھے اندر کی کیا کیا باتیں بتا گیا ہے۔ لڑکی کا ذکر آیا تو عثمان نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "ملک صاحب! یہ تفتیش میرے سُپرد کر دیں۔ آپ کوئی اور کام کریں۔ نیلی آنکھوں والی لڑکی سے آپ کا کیا تعلق۔ بڑا گندہ کیس

ہے، مجھے دے دیں۔"

اُس کی زندہ دلی نے میری تھکن دُور کر دی۔ کچھ دیر اس سے ساتھ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ میں نے اُسے لڑکی کے ماں باپ (اگر وہ واقعی اس کے ماں باپ تھے) کے گاؤں کا نام بتا کر کہا کہ وہ کل سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچ جاتے اور انہیں تھانے لے آتے۔ لڑکی کے متعلق بھی اُسے ضروری ہدایات دیں اور کہا ــ "عثمان! لڑکی اگر ایسی ہی خوبصورت ہے جیسی بتائی گئی ہے تو تم شریف باپ کے حلالی بیٹے کی طرح اسے میرے پاس لے آنا۔ اگر تم نے تفتیش خراب کی تو تمہیں گھر بھجوا دوں گا۔"

"یہی تو میری مجبوری ہے ملک صاحب!" اُس نے کہا ــ "کہ میرا باپ شریف آدمی ہے۔ مجھے اُس کی عزت کی خاطر دل پر پتھر رکھنا پڑتا ہے۔"

کھوجی قتل ہو گیا

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ میں نے عثمان سے کہا کہ کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ ہم تھانے سے نکل رہے تھے جب عثمان نے مجھے یاد دلایا کہ اشرف علی کانسٹیبل اور راما کھوجی ابھی تک واپس نہیں آئے۔ میں سُنا چکا ہوں کہ راما کھوجی سے میں نے کہا تھا کہ گھوڑی

کا کھُرا جہاں تک جاتا ہے وہ وہاں تک چلا جائے اور اگر مدد کی ضرورت ہو تو کسی قریبی گاؤں کے نمبردار، ذیلدار اور سفید پوش کے ہاں چلا جائے۔ اشرف علی کانسٹیبل نے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسے رامے کے ساتھ بھیج دیا گیا تھا۔ عثمان نے مجھے یاد دلایا کہ وہ دو لوں ابھی تک نہیں آئے تو میں یہ سمجھ کر پریشان نہ ہُوا کہ شام کا کھانا کھانے کسی گاؤں میں رُک گئے ہوں گے۔ مجھے خوشی بھی ہوئی کہ اُن کے ابھی تک نہ آنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ رامے کھوجی نے گھوڑی کا سراغ لگا لیا ہے اور میرے لئے اچھی خبر لائے گا۔ اتنی زیادہ دیر کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔

گھر پہنچ کر میں وردی اُتار رہا تھا کہ دروازے پر بڑی زور سے دستک ہوئی اور اس کے ساتھ گھبرائی ہوئی آواز آئی — "ملک صاحب!" — یہ ہیڈ محرر کانتی کمار کی آواز تھی۔ میں نے عثمان سے کہا — "جاناں یار، اس کافر کو اندر لے آنا۔ بات کچھ بھی نہیں ہو گی اور پیچھے پیچھے دوڑا آیا ہے" — وہ اکثر گھبرایا گھبرایا رہتا تھا۔

کانتی کمار اندر آیا تو اشرف علی کانسٹیبل بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں نے پُوچھا — "شرفو! اچھی خبر لائے ہو نا؟"

"نہیں ملک صاحب!" — اُس نے کہا اور دھڑام سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تب میں نے لالٹین کی روشنی میں اُس کے چہرے کی گھبراہٹ دیکھی۔ بولا — "بہت بُری خبر لایا ہوں۔"

"فوراً بولو۔ کیا ہو گیا ہے؟"

"راما کھوجی قتل ہو گیا ہے" — اُس نے جواب دیا۔

"کیا کہا؟" — میں نے حیرت سے پوچھا — "راما کھوجی قتل ہو گیا ہے؟"

"جی ملک صاحب!" اُس نے کہا — "معلوم نہیں اللہ نے مجھے کس طرح بچا لیا ہے۔ گھوڑی کا کھُرا ہمیں دُور تک لے گیا۔ صاف کھُرا تھا۔ آگے وہ علاقہ آ گیا جو ذرا گہرائی میں ہے اور اس میں چٹانیں اور ٹیکریاں ہیں۔ آپ نے یہ علاقہ دیکھا ہے۔ وہاں کھُرا غائب ہو گیا۔ راما کھُرا ڈھونڈتا رہا۔ وہ کہتا تھا کہ گھوڑی یہاں سے ضرور گزری ہے۔ راما ایک جگہ بیٹھ گیا اور سر جھکا کر زمین کو دیکھنے لگا۔ میں بھی اس سے آٹھ دس قدم دُور زمین پر کھُرا ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے زمین پر کچھ بھی نظر نہ آیا تو میں نے رامے کی طرف دیکھا۔ مجھے چار آدمی دکھائی دیئے جن کے چہرے اور سر پگڑیوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں ہماری ہی لاٹھیوں جتنے موٹے ڈنڈے تھے۔ میں سمجھا وہ کہیں جا رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں وہ جھاڑیوں کے پیچھے چھُپے ہوئے تھے یا کہاں سے اچانک ہی آ گئے تھے۔ راما ابھی تک بیٹھا زمین پر کوئی کھُرا دیکھ رہا تھا...

"اِن آدمیوں نے رامے کھوجی پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔ راما اُٹھ نہیں سکا۔ اِن میں سے کسی نے میری طرف دیکھ کر کہا — "اسے بھی ختم کر دو اور دونوں کی لاشیں اُٹھا لے چلو" — میرے پاس

یہ چھوٹا سا ڈنڈا تھا۔ اس سے میں چار آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں بھاگ اُٹھا۔ ان میں سے دو آدمی میرے پیچھے دوڑے۔ میں اپنے تھانے کا رُخ کرنے کی بجائے کسی اور طرف ہو لیا۔ انہوں نے میرا راستہ روکنے کے لئے راستہ بدل دیا اور مجھے روک لیا۔ میں ایک چٹان پر چڑھ گیا اور دوسری طرف اُتر گیا۔ وہ اُدھر آ گئے۔ میں ایک طرف بھاگ اُٹھا سورج غروب ہو گیا تو وہ واپس چلے گئے اور میں ایک گاؤں میں نمبردار کے گھر چلا گیا۔ اُسے سارا واقعہ سُنایا۔ اُس نے مجھے کھانا کھلایا، پھر کلہاڑیوں سے مسلح چار آدمی اپنے ساتھ لے کر مجھے تھانے میں لے آیا۔ نمبردار اور یہ آدمی تھانے میں بیٹھے ہیں۔"

"انہوں نے حملہ تقریباً کتنے بجے کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"تین اور چار بجے کے درمیان" — اُس نے جواب دیا۔

واردات — پُراسرار اور سنگین

میں نے اُس کا بیان بہت مختصر کر کے سُنایا ہے۔ اُس نے طویل تفصیل سُنائی تھی۔ میں نے اور عثمان نے اس سے بہت کچھ پوچھا بھی تھا۔ اشرف علی قابلِ اعتماد کانسٹیبل تھا۔ میں اُسے عقل والا کانسٹیبل کہا کرتا تھا۔ اُس کی سروس نو دس سال ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف کوتاہی یا بیوقوفی کی کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس سنگین واقعہ میں بھی میں نے اُس

پر اعتبار کیا۔ اُس نے یقین دلا دیا کہ راما کھوجی مارا جا چکا ہے اور اُس کی لاش وہاں نہیں ہو گی۔ رات کے وقت موقعۂ واردات پر جانا مناسب نہیں تھا کیونکہ خطرہ تھا کہ یہ کسی منظم گروہ کی واردات ہے اور یہ گروہ رات کو مجھے گھات میں لے سکتا ہے۔ میں جان گیا کہ گھوڑی کی چوری اور پیر کے گھر سے لڑکی کا فرار یا اغوا ایک ہی واردات کی دو کڑیاں ہیں اور یہ پیشہ ور مجرموں کی واردات ہے۔ کھوجی اور کانسٹیبل پر حملہ اس کا ثبوت تھا کہ اس گروہ نے تماشائیوں کے روپ میں اپنے آدمی میرے ساتھ لگا رکھے تھے۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے کھوجی کی حفاظت کے لئے زیادہ کانسٹیبل نہ بھیجے۔ میں نے جو کانسٹیبل بھیجا وہ غیر مسلح تھا۔ اُس کی پیٹی کے ساتھ بندھا ہوا پولیس کا چھوٹا سا ڈنڈا تھا جسے بیٹن کہا کرتے تھے۔

میں چونکہ اس واردات کو ایک گھوڑی کی چوری کی معمولی سی واردات سمجھ رہا تھا اس لئے اُدھر دھیان ہی نہ گیا کہ کوئی جرائم پیشہ گروہ سرگرم ہے۔ رامے کھوجی کے قاتل اسی گروہ کے ہو سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھا ہو گا کہ کھوجی کھرا اُٹھاتا صحیح سمت جا رہا ہے تو انہوں نے اس ویرانے میں گھات لگائی اور کھوجی اور کانسٹیبل کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ کانسٹیبل خوش قسمت تھا کہ زندہ تھانے آ گیا۔ میں اُس جگہ کو جانتا تھا۔ ویرانہ تھا۔ وہ جگہ قتل، تعاقب اور فرار کے لئے موزوں تھی۔

گھوڑی کی چوری ایک پُراسرار اور سنگین واردات بن گئی۔ میں

نے عثمان سے کہا کہ وہ اشرف علی کے بیان پر رامے کھوجی کے قتل اور اشرف علی کو قتل کرنے کی نیت سے تعاقب کی ایف۔آئی۔آر تحریر کرے۔ وہ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ کوئی تھانیدار کوتاہی اور ٹال مٹول کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ انگریز ڈی۔ایس۔پی اچانک دورے پر آجاتا اور پورا ریکارڈ دیکھتا تھا۔ انگریز ڈی۔ایس۔پی اپنے ہر تھانے کے علاقے میں بھی گھوما کرتے اور زیرِ تفتیش کیسوں کی جانچ پڑتال بڑی باریکی اور سختی سے کیا کرتے تھے۔ مجھے اشرف علی نے یہ خبر سنا کر میری بھوک مار دی۔ غصہ الگ تھا۔ کھوجی کا قتل میرے لئے بہت بڑا چیلنج تھا۔

ان علاقوں میں دو اشتہاری مجرم تھے۔ ایک بینا اور دوسرا لبا کھا۔ ان کے اپنے اپنے گروہ تھے۔ دونوں کا پیشہ رہزنی اور ڈکیتی تھا۔ اس زمانے میں دیہاتی علاقوں میں آبادیاں کم اور ویرانے زیادہ تھے، اس لئے رہزنی کی وارداتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ بڑے پیمانے کی ڈاکہ زنی بھی ہوتی تھی۔ ان گروہوں اور پولیس کی جنگ جاری رہتی تھی۔ کبھی آمنے سامنے کا مقابلہ بھی ہو جاتا تھا۔ اکثر آنکھ مچولی جاری رہتی تھی۔ یہ گروہ واردات کر کے غائب ہو جاتے اور پولیس انہیں ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ کبھی ان کا کوئی آدمی ہاتھ آجاتا تو پولیس اُسے زیادہ سے زیادہ سزا دلاتی تھی۔ کبھی پولیس کا کوئی ملازم ان کے ہاتھ چڑھ جاتا تو وہ اُسے ہمیشہ کے لئے غائب کر دیتے تھے۔ پولیس نے ان کی گرفتاری کے لئے اپنے مخبر پھیلا رکھے تھے اور ان جرائم پیشہ گروہوں

نے اپنے مخبر پولیس کے پیچھے لگا رکھے تھے۔

ان جرائم پیشہ گروہوں میں بعض خانہ بدوش قبائل تھے۔ ان کے مرد نقب زنی، ڈاکہ زنی اور راہزنی کو پیشہ بناتے ہوتے تھے اور ان کی عورتیں گھروں میں چوری چکاری اور عصمت فروشی کرتی تھیں۔ میرے علاقے کے جو دو اشتہاری مجرم، مینا اور لباکھا تھے ان کا تعلق اِن خانہ بدوشوں کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ دُور دُور تک وارداتیں کرتے تھے۔ سرکاری کاغذات میں ان کی رہائش یا مستقل ٹھکانہ میرے علاقے میں لکھا ہوا تھا، اس لئے یہ میرے لئے مستقل دردِ سر بنے ہوتے تھے۔ وہ قتل اور ڈاکے کی متعدد وارداتوں میں مطلوب تھے۔ ہمارے لئے دشواری یہ بھی کہ ہمارے جو مخبر تھے وہ اُن کے لئے بھی مخبری کرتے تھے یعنی یہ مخبر دوغلے تھے۔ جس گاؤں میں یہ مجرم عارضی قیام کرتے تھے اُس گاؤں کے لوگ بھی ان کی حفاظت کرتے تھے۔ اس کے صِلے میں یہ جرائم پیشہ گروہ اُس گاؤں کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے اور اُسے ڈاکوؤں وغیرہ سے بچاتے رکھتے تھے۔ میں نے اور مجھ سے پہلے تھانیداروں نے مخبروں کی اطلاع پر چھاپے مارے تھے لیکن مجرم دوغلی مخبری سے فائدہ اُٹھا کر ہر بار نکل جاتے تھے۔ ایک دو بار فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔

اب اِن میں سے کسی نے میرے ہی کھوجی کو قتل کروا دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو یہ دھوکہ بھی دیا کہ شاید کھوجی کی اپنی برادری میں

دشمنی ہوگی اور اسی کے نتیجے میں وہ قتل ہوگیا ہوگا۔ دوسرے دن میرا یہ شک یہ بتا کر رفع کر دیا گیا کہ مقتول کا کوئی دشمن نہیں تھا۔

کھوجی کی صرف ہڈیاں ملیں

مجھے پیر حکیم صاحب کو شاملِ تفتیش کرنا تھا۔ مجھے اُسی وقت یعنی رات کو اُس کے پاس جانا چاہیئے تھا۔ کھوجی کے قتل کے موقعۂ واردات پر جانے کا میں فیصلہ کر چکا تھا کہ صبح جاؤں گا۔ رات ضائع نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ گھوڑی کی چوری کی یہ واردات بڑا ہی سنگین جرم نظر آنے لگی تھی۔ میرے دماغ میں یہ قیافہ آیا کہ کسی جرائم پیشہ گروہ نے گھوڑی چوری کی ہے اور لڑکی بھی اسی گروہ نے اغوا کی ہے۔ یہ اس گروہ کا سرغنہ ہو سکتا تھا جسے زمیندار کی گھوڑی بھی اچھی لگی تھی اور نیلی آنکھوں والی لڑکی بھی۔ مجھے اب ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اب پیر کو شاملِ تفتیش کرنا پہلے سے زیادہ ضروری ہوگیا تھا لیکن میں نے رات کو اُس کے گھر جانا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ وہ شراب کے نشے میں بدمست ہوگا۔ کوئی بات سمجھ نہیں سکے گا اور ڈھنگ کی کوئی بات نہیں کر سکے گا۔ میں اسے تھانے بلا سکتا تھا لیکن اس خیال سے نہ بلایا کہ اُس نے پیری کے رُعب میں آنے سے انکار کر دیا تو مجھے اس کے خلاف کوئی سنگین کارروائی کرنی پڑے گی جو میں تفتیش کے اس مرحلے

میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مجھے یہ بھی توقع تھی کہ وہ خود ہی میرے پاس آئے گا، یا مجھے بلائے گا۔ میں نے اُس کی غیرحاضری میں اُس کے گھر میں داخل ہو کر اور اُس کی چھت پر جا کر تحقیقات کی تھی۔ کسی معمولی سے آدمی کے گھر پولیس چلی جائے تو وہ بھی اسے اپنی بے عزتی سمجھتا تھا ... یہ تو پیر تھا جس نے اپنے آپ کو خدا کے بعد کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس نے میری یہ گستاخی اور اپنی درگاہ کی بے ادبی برداشت نہیں کی ہو گی، لیکن اُس نے کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ گھر واپس نہ آیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ آگیا ہو۔ اُس کے آدمیوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آ جائے گا۔ ردِ عمل کا اظہار نہ کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُس کے جس خاص آدمی نے مجھے نیلی آنکھوں والی لڑکی کا راز بتایا تھا، اُس کے ساتھ میں نے خاص قسم کی باتیں کی تھیں جو اس آدمی نے پیر کو بتا دی ہوں گی۔ اس آدمی نے پیر کو مشورہ دیا ہو گا کہ وہ دبک کے بیٹھا رہے۔

صبح ابھی پوری طرح روشن نہیں ہوئی تھی جب میں موقعۂ واردات کو روانہ ہو گیا۔ میں نے کانسٹیبلوں کی کچھ نفری ساتھ لے لی تھی۔ نصف نفری رائفلوں سے مسلح تھی۔ عثمان تین کانسٹیبل ساتھ لے کر نیلی آنکھوں والی لڑکی کے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ اُسے لڑکی کے ماں باپ کو تھانے لانا اور لڑکی کا سراغ بھی لگانا تھا۔

میں اشرف علی کی راہنمائی میں کھوجی کے قتل کی جگہ پہنچا۔ میں بتا

چکا ہوں کہ یہ جگہ گھات اور قتل کے لئے موزوں تھی۔ کانسٹیبل اشرف علی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ کھوجی کی لاش وہاں نہیں ہوگی، لیکن لاش وہیں پڑی تھی۔ اگر مجھے معلوم نہ ہوتا کہ یہاں کھوجی قتل ہوا ہے تو میں کبھی نہ مانتا کہ یہ رامے کھوجی کی لاش کی ہڈیاں ہیں۔ بھیڑیوں، الگڑ بگوّں اور گیدڑوں نے سارا گوشت کھا لیا تھا۔ باقی جو کسر رہ گئی وہ گدھ پوری کر رہے تھے۔ وہاں صرف ہڈیاں تھیں۔ کھوپڑی (سر اور چہرے) پر کہیں کہیں کھال کا ٹکڑا نظر آتا تھا۔ آنکھیں نکالی جا چکی تھیں۔ جوتی، پگڑی اور کپڑوں کے ٹکڑوں سے شناخت کیا گیا کہ یہ رامے کھوجی کی لاش ہے۔ راما نیک انسان تھا۔ اپنے فن کا ماہر تھا۔ دیانتدار اتنا کہ دو بار مجرموں نے اسے رشوت پیش کی اور کہا تھا کہ وہ پولیس کو گمراہ کرے۔ یہ رشوت اس رقم سے بیس گنا زیادہ تھی جو اُسے پولیس سے ملتی تھی لیکن اس نے رشوت قبول نہیں کی تھی۔ یہ اُس وقت کی دو وارداتیں تھیں جب میں اس تھانے میں نہیں آیا تھا۔

ایسے آدمی کا یہ انجام دیکھ کر میرے آنسو نکل آتے۔ تھانیدار جذباتی نہیں ہوا کرتے مگر میں جذباتی ہو گیا اور اشرف علی سے کہا — "شرفو! تم بھی اس کے ساتھ مر جاتے، اس کا ساتھ نہ چھوڑتے۔"

اشرف علی سے کہا کہ وہ جگہیں بتاتے جہاں کھوجی بیٹھا تھا اور جہاں وہ خود تھا۔ اُس نے رات کو سنائی ہوئی کہانی پھر سنائی اور مختلف جگہیں دکھائیں۔ میں نے اُس کے بھاگنے کا راستہ بھی دیکھا۔ وہ جس

گاؤں میں چلا گیا تھا وہ موقعۂ واردات سے ڈیڑھ میل دُور تھا۔ رامے کھوجی کی ہڈیاں اکٹھی کروائیں۔ اُس کے دو بیٹے اور بیوی اطلاع ملنے پر وہاں آ گئے تھے۔ اُن کا رونا میری برداشت سے باہر ہُوا جا رہا تھا۔ جب اُس کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر گیارہ بارہ سال تھی، روتا اور مجھے کہتا تھا — "یہ میرے باپُو کی ہڈیاں نہیں، میرا باپو زندہ ہے۔ کہاں ہے میرا باپُو؟" — تو میرے لئے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کھوج کے فن کے لحاظ سے رامے کو میں بھی اپنا باپُو سمجھا کرتا تھا۔ میں نے ہڈیاں اکٹھی کروا کے ضروری کاغذی کارروائی کی۔ گواہوں کے انگوٹھے لگوائے اور ہڈیاں ہسپتال بھجوا دیں جو بارہ میل دور قصبے میں تھا۔

میں زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس ذہنی حالت میں فوراً نہ دیکھ سکا کہ وہاں خون کا ذرا سا بھی نشان نہیں تھا۔ میں نے اشرف علی سے کہا کہ یہاں خون نہیں ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ انہوں نے مقتول کو ڈنڈوں سے مارا ہے اور کوئی تیز دھار ہتھیار استعمال نہیں کیا۔ لاش کی چونکہ ہڈیاں رہ گئی تھیں اس لئے یہ دیکھنا ناممکن تھا کہ رامے کے جسم پر ضربیں کیسی تھیں۔ ڈنڈے کی ضرب سے عموماً خون نہیں نکلتا۔ کنپٹی پر ایک ڈنڈا لگتا تو انسان کے ہاتھ سے لگ جاتے تو بعض انسان اسی سے مر جاتے ہیں۔

مجھے اب ڈاکٹر کی رپورٹ کا بھی انتظار کرنا تھا اور پیر حکیم صاحب کو بھی گھبرانا تھا۔ گھوڑی کی چوری کی معمولی سی واردات پیچیدہ ہو گئی تھی۔

نیلی آنکھوں والی کس کی لڑکی تھی؟

وہاں سے پیر حکیم صاحب کا گاؤں دو اڑھائی میل دُور تھا۔ سوچا کہ پیر سے ملتا چلوں لیکن یاد آ گیا کہ عثمان لڑکی کی ماں اور اُس کے باپ کو لے آیا ہوگا۔ پیر کے ہاں جانے کا ارادہ اس خیال سے بدل دیا کہ لڑکی کے والدین سے اُس کے متعلق یا اُس کے خلاف مواد اکٹھا کر لوں۔ میں تھانے گیا۔ عثمان انہیں لے آیا تھا۔ عثمان نے مجھے بتایا کہ ان دونوں کو معلوم نہیں کہ لڑکی کہاں ہے۔ یہ اُسے پیر کے گھر چھوڑ آتے تھے اور اس لڑکی کو یہ اپنی بیٹی کہتے ہیں۔ عثمان نے گاؤں سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ لڑکی کیسی ہے۔ اسے بتایا گیا کہ بہت خوبصورت لڑکی ہے اور اتنی ہی شیطان اور دلیر۔ عثمان نے جن تین چار آدمیوں سے لڑکی کے متعلق پوچھا تھا اُن سب نے کہا تھا کہ وہ لڑکی کے گورے رنگ اور نیلی آنکھوں پر حیران ہیں۔ عثمان کو لڑکی کے متعلق ایک یہ بات بھی ملی تھی کہ یہ ان میاں بیوی کی اولاد نہیں ہے۔ انہوں نے یہ لڑکی دودھ پینے کی عمر میں کہیں سے چرائی ہے۔ یہ دونوں اس گاؤں میں اُس وقت آ کر آباد ہوتے تھے جب یہ لڑکی ڈیڑھ دو سال کی تھی۔

میں نے ان دونوں کو تسلی دلاسہ دیا اور بتایا کہ اُن پہ کوئی الزام

نہیں، ان کی صرف گواہی کی ضرورت ہے۔ میں نے باپ کو اپنے دفتر میں بٹھایا۔ اُس کی بیوی کو باہر بٹھائے رکھا۔ اس آدمی کی عمر چالیس سال سے اوپر ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے تسلی تو بہت دی تھی لیکن تھانے اور پولیس کی دہشت بہت بُری ہوتی ہے۔ یہ غریب آدمی تھا۔ میرے سامنے بیٹھتے ہی اُس کے آنسو بہنے لگے، پھر بولا — "سرکار (پیر حکیم صاحب) ٹھیک فرماتے تھے کہ یہ لڑکی جنات کی نسل سے ہے۔"

"میں نے سُنا ہے لڑکی بہت ہی خوبصورت تھی" — میں نے کہا — "میں تم سے قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی، مجھے یہ بتا دو کہ یہ لڑکی تمہیں کہاں سے ملی تھی؟"

"یہ میری اپنی لڑکی ہے حضور!" — اُس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا — "اسے میری بیوی نے جبل پورہ میں جنم دیا تھا۔ میں خود حیران ہوتا ہوں کہ ایسے رنگ اور آنکھوں والی لڑکی میرے گھر کیسے پیدا ہوئی۔ اس کا چہرہ اپنی ماں جیسا تھا۔ اس کی ماں اب تو محنت مزدوری کی وجہ سے مرجھا گئی ہے۔ جوانی میں اس کے نقش بہت اچھے تھے، لیکن لڑکی کی رنگت نہ میری ہے نہ اپنی ماں کی۔"

میرے چند ایک سوالوں کے بعد میرے کہنے پر اُس نے جو بیان دیا وہ مختصراً اس طرح تھا کہ لڑکی کی عمر ابھی پورے بیس سال نہیں ہوئی تھی۔ اس لڑکی کے بعد اس شخص کے گھر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اسے ایک بیٹے کی خواہش بھی تھی اور ضرورت بھی۔ اُس نے پیر حکیم صاحب

کی شہرت سُن رکھی تھی لیکن غربت کی وجہ سے "درگاہ" پر جاتا نہیں تھا۔ نذرانے اور چڑھاوے کے لئے اُس کے پاس رقم نہیں تھی۔ واردات سے تین ساڑھے تین مہینے پہلے ایک امیر کبیر آدمی جو گھوڑے پر سوار تھا اُس کے گھر آیا اور اس لڑکی کے متعلق پوچھا کہ یہ تمہاری بیٹی ہے؟ باپ نے بتایا کہ یہ اُسی کی بیٹی ہے۔ اس آدمی نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے گاؤں چلا چلے جہاں وہ اُسے کچھ زمین اور رہنے کو مکان دے دے گا۔ باپ سمجھ گیا کہ اس آدمی کی نظر اُس کی بیٹی پر ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ بٹائی پر کسی کی زمین کاشت کرتا ہے۔ یہ فصل پک کر اُٹھ جاتے تو وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر آجائے گا۔

یہ امیر کبیر آدمی بھی زمیندار تھا جس کی گھوڑی چوری ہوگئی تھی۔ میں مصلحتاً اس کا نام ظاہر نہیں کر رہا۔ یہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ راستے میں اس لڑکی کا گاؤں پڑتا تھا۔ اُس نے لڑکی کو گاؤں سے باہر دیکھا تھا۔ یہ زمیندار لڑکی کے باپ کو کچھ رقم دے کر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ کئی بار اس غریب آدمی کے گھر گیا۔ کبھی لڑکی کے لئے کپڑے لے جاتا کبھی کوئی اور تحفہ لے جاتا۔ لڑکی کا باپ پہلے ہی پریشان تھا۔ لڑکی پر کئی لوگوں کی نظر تھی۔ اتفاق سے لڑکی اتنی ہوشیار اور چالاک تھی کہ کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ اسے بدنام تو کیا جاتا تھا لیکن کسی کے پاس اس کے چال چلن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔

باپ نے بیان میں کہا کہ یہ زمیندار لڑکی کو براہِ راست تحفے اور

پیسے دینے لگا۔ لڑکی یہ چیزیں اور پیسے لے لیتی تھی۔ پھر لڑکی ایک رات باہر نکلی اور دو تین گھنٹوں بعد آئی۔ باپ نے پوچھا کہاں رہی؟ اُس نے بے رُخی سے گول گول سا جواب دیا۔ باپ لڑکی سے کچھ خائف رہتا تھا۔ اُس پر یہ خوف غالب تھا کہ لڑکی کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ نہ جائے۔ تین تین چار چار دنوں کے وقفے سے لڑکی تین بار راتوں کو باہر نکلی اور دیر سے گھر آئی۔ ماں باپ یہ سمجھے کہ زمیندار رات کو آتا ہے اور لڑکی کہیں اُسے ملنے جاتی ہے۔ یہ غریب لوگ اتنے بڑے زمیندار پر اتنا بڑا الزام لگانے سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اُس زمیندار سے کہیں کہ لڑکی کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لے مگر وہ ڈرتے تھے کہ ایسا امیر کبیر آدمی ان غریبوں کی بیٹی کو قبول نہیں کرے گا۔ وہ تو لڑکی کو تفریح کا ذریعہ بنا رہا تھا۔

پیر، زمیندار اور جنات

ایک روز زمیندار اُن کے گھر آیا تو ماں نے زمیندار سے کہہ دیا کہ وہ لڑکی کے ساتھ شادی کر لے۔ زمیندار نے بخوشی منظور کر لیا اور کہا کہ تم لوگ میرے پاس آجاؤ، میں شادی کر لوں گا۔ اب باپ کے پاس زمیندار کے دیتے ہوئے پیسے آ گئے تھے۔ ایک روز وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پیر حکیم صاحب کے دربار میں حاضر ہوا۔ اُس کے پاؤں

میں نذرانہ رکھا اور عرض کی، یا سرکار! لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ یہ ہماری واحد اولاد ہے۔ دعا کریں خدا ہمیں اولادِ نرینہ دے۔ پیر نے جوان لڑکی کا نام سُنا تو کہا کہ اُسے ساتھ لاؤ۔ ہم دیکھیں گے کہ اس لڑکی نے اپنے پیچھے اولاد کا دروازہ کیوں بند کر دیا ہے۔ دوسرے روز وہ لڑکی کو پیر کے پاس لے گئے۔ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ ایسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر پیر حکیم صاحب کے دل میں کیا آیا ہو گا۔ اُس نے لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا۔ اُس کے ہاتھ اُلٹے کر کے دیکھے اور لڑکی کو باہر بھیج کر اُس کے ماں باپ سے کہا ”یہ لڑکی انسان نہیں۔ یہ جنّات کی نسل سے ہے۔ تم اپنا رنگ روغن دیکھو اور لڑکی کا رنگ روغن دیکھو۔ کیا تمہارے خاندان میں کسی کی آنکھیں اس طرح نیلی ہیں؟ جب تک یہ لڑکی زندہ ہے، تمہارے گھر اولاد نہیں ہو گی۔“

اس غریب اور گنوار آدمی نے یہ نہ سوچا کہ جن کسی انسان کے بطن سے کس طرح پیدا ہو سکتا ہے مگر وہ پہلے ہی حیران تھا کہ گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی لڑکی اُس کے گھر کیسے پیدا ہوئی۔ اُس نے پیر کا انکشاف سچ مان لیا۔ پیر نے اُسے کہا کہ وہ لڑکی کو اُس کے پاس لاتا رہے۔ اُس نے لڑکی کی ماں کو ایک تعویذ دے دیا۔ باپ دوسرے دن لڑکی کو پیر کے پاس لے گیا۔ پیر نے لڑکی کو لٹا کر کچھ پڑھا اور اُس کی آنکھوں میں پھونکیں ماریں۔ کچھ اُوٹ پٹانگ حرکتیں کیں اور حکم دیا کہ کل اسے پھر لے آنا۔

دوسرے دن باپ لڑکی کو لے گیا تو پیر لڑکی کو الگ کمرے میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی کو باہر لایا۔ لڑکی کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ باہر نکل گئی۔ پیر نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ یہ شیطان جن ہے۔ تم اسے کہنا کہ میرے ساتھ آئندہ بدتمیزی نہ کرے۔ میرا حکم مانے۔ کل اسے پھر لے آنا ..... باپ باہر نکلا تو لڑکی اُس کا انتظار کئے بغیر اپنے گاؤں کو جا رہی تھی۔ باپ دوڑ کر اُس سے جا ملا۔ لڑکی اُس پر برس پڑی۔ کہنے لگی کہ وہ آئندہ یہاں نہیں آئے گی۔ اُس نے پیر کو بدمعاش اور لوفر لفنگا کہا۔ باپ کا پسینہ نکل آیا۔ پیر کی بے ادبی کا انجام اُسے ڈرانے لگا۔ لڑکی نے باپ سے کہا۔ "اگر مجھے بدچلن بنانا ہے تو کیا یہی آدمی رہ گیا تھا؟" لڑکی نے باپ کو پوری طرح بتایا کہ اِس شخص نے اسے پھانسنے کے کیسے کیسے جتن کئے ہیں ۔۔ "مجھے کہتا ہے کہ تم ایک جن کی اولاد ہو، میں تمہیں انسان بنا دوں گا۔"

اگلے روز لڑکی نے پیر کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اس سے اگلے روز بھی نہ گئی۔ اُس روز زمیندار آ گیا۔ وہ اس گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ پیر حکیم صاحب بنفس نفیس تشریف لے آئے۔ یہ شخص اتنی خوبصورت چڑیا کو اپنے جال سے اتنی آسانی سے نکل جانے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پیر نے لڑکی کے باپ کو الگ لے جا کر کہا ۔ "مجھے رات کو اشارہ ملا ہے کہ اس لڑکی کا باپ اُن جنات میں سے ہے جو میرے قبضے میں ہیں۔ میں نے اُسے حاضر کر کے کہا ہے کہ لڑکی سے

اپنا قبضہ اٹھا لے تاکہ اس غریب آدمی کے گھر اولاد پیدا ہو۔ یہ جن ابھی مانا نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ میری بیٹی کو اپنے پاس لے آؤ .... تم غریب اور نادار آدمی ہو۔ مجھے خدا کا حکم ہے کہ غریبوں کو آفات سے بچاتے رکھوں .... اور یاد رکھو۔ اس شخص (زمیندار) کو گھر میں داخل نہ ہونے دیا کرو۔ یہ ناپاک آدمی ہے۔ یہ اس لڑکی کے لئے یہاں آتا ہے۔ اگر لڑکی اس کی باتوں میں آگئی تو تمہارا جھونپڑا جل جائے گا اور اور تمہاری بیوی کی کوکھ ہمیشہ کے لئے ویران ہو جائے گی۔"

میرے شہری قارئین اور تعلیم یافتہ حضرات پیر کی ان باتوں کو شاید کسی افسانے کی تحریر سمجھیں۔ میں تو اپنی جوانی کے دور کی بات کر رہا ہوں، آج بھی دیہات میں چلے جائیں، آپ کو پیروں کی یہی باتیں سنائی دیں گی اور لوگ انہیں برحق مانتے ہیں۔ ایسے دیہات کی کمی نہیں جو ڈاکٹروں اور جدید دوائیوں سے محروم ہیں۔ وہاں تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے چلتے ہیں۔ اگر کسی فوجی کے ہاتھ کوئی انگریزی دوائی چلی جائے تو پیر، شاہ اور امام مسجد اسے شرک قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہسٹریا، مرگی اور نمونیہ کو بھی شر شرار اور جنات کا قبضہ یا سایہ کہتے اور اللہ کے سادہ دل بندے اسے تسلیم کرتے ہیں۔ مجھے جب لڑکی کا باپ پیر کی یہ باتیں سنا رہا تھا تو میں بالکل حیران نہیں ہو رہا تھا۔ میں آج بھی حیران نہیں ہوتا۔

پیر کی ایسی خوفناک بات سن کر باپ بہت خوفزدہ ہوا۔ پیر لڑکی کے سر اور منہ پہ ہاتھ پھیر کر چلا گیا۔ باپ نے زمیندار کو الگ لے جا کر

کہا کہ یہ لڑکی اُس کی بیٹی نہیں یہ ایک جنّ کی اولاد ہے۔ اُس نے زمیندار کو یہ بھی بتایا کہ لڑکی اُس (زمیندار) کی باتوں میں آگئی تو نتیجہ کیا ہوگا۔ زمیندار نے لڑکی کے باپ کو بتایا کہ یہ پیر نوسرباز اور بدکار ہے اور یہ لڑکی پر قبضہ کرنے کے جتن کر رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ جنّ انسان کے بطن سے جنم نہیں لے سکتے۔ باپ بالکل گنوار اور پسماندہ ذہن کا تھا۔ اُس نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور زمیندار کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ "سرکار" کی بے ادبی اُس کے گھر بیٹھ کر نہ کرے ورنہ اس غریب کا جھونپڑا جل جائے گا اور اس کی بیوی کے ہاں کبھی بچہ پیدا نہیں ہوگا۔ زمیندار اسے قائل نہ کرسکا۔ زمیندار کوئی عالم فاضل تو نہیں تھا جو علم کے زور سے اس گنوار آدمی کو اس فریب کار پیر کے خلاف قائل کرتا۔ وہ خود فریب کار تھا اور وہ پیر کو رقیب بھی سمجھنے لگا تھا۔

لڑکی پیر کے گھر میں

باپ نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ وہ بہت بُرے چکر میں پھنس گیا۔ ایک طرف پیر تھا" جس کے ہاتھ میں اُس کی قسمت اور جنات تھے"۔ دوسری طرف یہ زمیندار تھا جسے نہ یہ باپ نہ گاؤں کا کوئی اور آدمی یہ کہہ سکتا تھا کہ اس گھر میں ایک لڑکی جوان ہے اس لئے اس گھر میں نہ آیا کرو۔ دیہاتیوں پر ایسے ہی پیروں، زمینداروں، جاگیرداروں اور

مُلاؤں کی حکومت رہی ہے (اور ابھی تک ہے) وہ انگریزوں کی بادشاہی میں بھی بے زبان تھے اور آزاد ہو کر بھی بے زبان ہیں۔ باپ لڑکی سے خوفزدہ رہنے لگا کیونکہ لڑکی جنات کی نسل سے تھی۔

ایک رات لڑکی پھر غائب ہو گئی اور آدھی رات کے بعد آئی۔ نہ ماں کو جرأت ہوئی نہ باپ کو کہ اُس سے پوچھتے کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔ اگلے سات دنوں میں زمیندار بھی ان کے ہاں آتا رہا اور پیر بھی دو دفعہ آیا۔ لڑکی کا اب یہ رویہ تھا کہ دونوں کے ساتھ ہنس کر بولتی اور اچھا برتاؤ کرتی، لیکن وہ پیر کے گھر جانے سے صاف انکار کر دیتی.... ماں اور باپ پیر کے ہاں جاتے تھے۔ ایک روز پیر نے انہیں اس قدر ڈرایا کہ وہ ڈر سے کانپتے گھر آئے۔ دونوں نے لڑکی کی اتنی منت سماجت کی کہ باپ نے لڑکی کے پاؤں چھو کر اُسے کہا کہ اُس کی شادی ہو جائے گی تو ماں باپ اکیلے رہ جائیں گے۔ پیر دعا کرے گا تو اولادِ نرینہ ہو گی جو بڑھاپے کا ساتھ اور سہارا ہو گی۔ لڑکی شاید یہ برداشت نہ کر سکی کہ باپ اُس کے پاؤں پڑا تھا۔ وہ پیر کے ہاں جانے پر رضامند ہو گئی۔

دوسرے روز لڑکی ماں باپ کے ساتھ پیر حکیم صاحب کے پاس گئی۔ پیر نے ماں باپ کے سامنے لڑکی سے کہا۔"میں شیطان اور بدنیت انسان نہیں ہوں۔ میں تمہارے وجود میں انسان کی روح ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس سے یہ ہو گا کہ تمہارے ماں باپ کے دن پھر جائیں گے"۔۔۔ کچھ ایسی ہی اور باتیں تھیں اور پیر کی اداکاری بھی تھی جس نے

لڑکی کو قائل کر لیا کہ وہ پیر کے ساتھ الگ کمرے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد پیر باہر آیا۔ لڑکی اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ پیر نے اُس کے ماں باپ سے کہا کہ اُس نے لڑکی کے باپ کو حاضر کر لیا ہے۔ وہ لڑکی کی ملکیت سے دستبردار نہیں ہو رہا۔ تم دونو گھر چلے جاؤ۔ چند دن لگیں گے۔ میں تمہیں خود بُلا لوں گا.... ماں اور باپ خوشی خوشی اپنے گاؤں چلے گئے۔ پیر کا جادو پُورا پُورا اثر کر چکا تھا۔ باپ نے مجھے بتایا کہ آٹھ نو روز بعد (گھوڑی کی چوری کی واردات والی صبح) پیر اس کے گھر آیا۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ اُس نے آتے ہی پُوچھا ”وہ نامراد کہاں ہے؟“ باپ نے پوچھا کہ سرکار کس کا پُوچھ رہے ہیں؟ ”سرکار“ نے انہیں بتایا کہ اُن کی لڑکی بھاگ آئی ہے۔ ماں باپ نے لاعلمی کا اظہار کیا مگر پیر مان نہیں رہا تھا۔ وہ اُن پر الزام لگائے جا رہا تھا کہ لڑکی اُس کے گھر سے بھاگ آئی ہے اور انہوں (ماں باپ) نے اُسے زمیندار کے حوالے کر دیا ہے یا اُسے کہیں چھپا دیا ہے۔

یہ بھی آپ کی دلچسپی کے لئے بتا دوں کہ پیر جب لڑکی کے گھر آتا تھا تو اس نے سر اور چہرہ کھیس میں چھپایا ہوا ہوتا تھا اور وہ اپنے خاص گھوڑے پر نہیں آتا تھا تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ یہ پیر حکیم صاحب ہے۔ یہ شخص اپنے مریدوں کے گاؤں کے دورے پر جایا کرتا تھا۔ اس کا دورہ ہمارے آج کل کے وزیروں سے کم نہیں ہوتا تھا۔ آگے آگے تین چار سبز جھنڈے، پیچھے پیر کی سواری اور اس کے پیچھے خصوصی

مریدوں اور درباریوں کا جلوس ہوتا تھا۔ یہ جلوس کلمہ شریف کا وِرد کرتا جاتا تھا، مگر لڑکی کے گھر وہ بہروپ میں جاتا تھا۔ لڑکی کا گاؤں پیر کے گاؤں سے اڑھائی میل کے لگ بھگ دُور تھا۔ اُس صبح بھی پیر بھیس میں چہرہ چھپاتے گیا۔ لڑکی کے ماں باپ روتے اور اُس کے قدموں میں بچھ بچھ جاتے تھے، مگر پیر کو ان پر اعتبار نہیں آ رہا تھا — وہ دوپہر تک ان کا خون خشک کرتا رہا، پھر دھمکی دے کر چلا گیا۔

باپ کا بیان ختم ہُوا تو میں نے لڑکی کی ماں کو بلایا۔ ماں کی آنکھیں نیلی نہیں تھیں۔ اُس کا رنگ گورا بھی نہیں تھا، البتہ اس علاقے کے لوگوں کی نسبت اُس کا رنگ نکھرا ہُوا گندمی تھا۔ اُس کے چہرے کے نقش اچھے تھے جو غربت، محنت مزدوری اور پریشانیوں کے اثرات سے بُجھے بُجھے سے تھے۔ میں اس کے رنگ اور نقوش کو یہ معمّہ حل کرنے کے لئے دیکھ رہا تھا کہ گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی بیٹی اس عورت کی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ غریب عورت تھی۔ بُری طرح ڈری ہوئی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کا ڈر دُور کیا۔ اُسے اپنی بہن کہا۔ ہمدردی کا اظہار کیا اور اُس نے زبان کھولی۔ اُس نے بالکل وہی بیان دیا جو اُس کا خاوند دے گیا تھا۔ دونوں کے بیانوں میں مجھے معمولی سا اختلاف بھی نظر نہ آیا۔ میں اُس کی حوصلہ افزائی کرتا اور اُسے تھپکے دیتا جا رہا تھا اور اُس کے دل سے یہ خوف بھی نکالتا گیا کہ اُس کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے گی۔ میرے اس رویّے سے

وہ بے تکلفی سے اور بے خوف ہو کر بیان دینے لگی۔ بیان ختم کرنے تک وہ بالکل ہی بے خوف ہو چکی تھی۔

گورے رنگ اور نیلی آنکھوں کا بھید

"لوگ کہتے ہیں یہ لڑکی تمہارے بطن سے پیدا نہیں ہوئی"— میں نے اُسے کہا — "تمہیں یہ لڑکی کہیں سے ملی تھی، یا یہ کسی اور کی بچی تھی جسے تم اُٹھا لائی تھیں؟"

اُس کے چہرے کا رنگ صاف طور پر پیلا پڑ گیا۔ وہ ڈر گئی کہ میں اُس پر بچی کے اغوا کا الزام عائد کر رہا ہوں۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اُس کی ایسی حالت دیکھ کر مجھے اُس پر ترس آگیا لیکن میں حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا — "بولو، سچ بتا دو گی تو میں کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔"

"میرے خاوند کو تو نہیں بتائیں گے؟" — اُس نے پوچھا اور اُس کے آنسو بہہ نکلے۔

"میں مسلمان ہوں" — میں نے کہا — "اور میں نے تمہیں بہن کہا ہے۔ کسی کو نہیں بتاؤں گا" — یہ میرے دل کی آواز تھی۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ لڑکی اُس کی اپنی ہے یا کہیں سے لائی گئی ہے۔

"یہ لڑکی میری اپنی ہے"۔۔۔اُس نے جواب دیا۔۔۔"لیکن یہ میرے خاوند کی نہیں"۔۔۔وہ چُپ ہو گئی اور اُس نے سر جھکا لیا۔ میری حوصلہ افزائی اور بہت سے اصرار کے بعد بولی۔۔۔"میری شادی جبل پور چھاؤنی میں ہوتی تھی۔ میں یتیم تھی۔ میرا خاوند بھی دُنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ مجھے ماموں نے پالا تھا۔ ہم سب چھاؤنی میں انگریز فوجی افسروں کے بنگلوں میں نوکر تھے۔ میرا خاوند ایک میجر کے بنگلے میں بیرہ تھا۔ وہ مجھے شادی کے بعد وہیں لے گیا۔ صاحب نے ہمیں سرونٹ کوارٹر دے دیا۔ ایک روز دوپہر کے وقت صاحب نے میرے خاوند کو آواز دی۔ بہت گرمی تھی۔ میرے خاوند کو بخار آرہا تھا۔ مجھے کہنے لگا کہ تم چلی جاؤ۔ کہہ دینا مجھے تیز بخار آرہا ہے۔ میں چلی گئی۔ صاحب بنگلے میں اکیلا تھا۔ اُس کی بیوی گرمیاں گزارنے پہاڑ پر چلی گئی تھی۔ میں نے اُسے ابھی دیکھا نہیں تھا....

"میں صاحب کے پاس گئی اور اُسے بتایا کہ میرا خاوند بیمار ہے، مجھے حکم دو۔ صاحب نے وہ کام مجھے بتایا جس کے لئے اُس نے میرے خاوند کو آواز دی تھی۔ میں نے کام کر دیا تو اُس نے مجھے سونے کے کمرے میں بلایا۔ اُس وقت میری عمر اٹھارہ اُنیس سال تھی۔ صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا کہ میری میم صاحب بہت بھدّی ہے۔ اُسے میں نے گرمی شروع ہونے سے پہلے ہی پہاڑ پر بھیج دیا ہے۔ اُس نے کہا۔۔۔ہمارا میم صاحب بہت کھراب۔

تم بہت اچھا۔— ہم غریب لوگ، انگریزوں کو بادشاہ اور اُن داتا سمجھتے ہیں۔ ہمارا ایمان پیٹ میں ہوتا ہے۔ صاحب نے میرے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ دیا۔۔۔ یہ لڑکی جسے میرا خاوند اپنی بیٹی کہتا ہے اس انگریز میجر کی بیٹی ہے۔ جب یہ بیٹی پیدا ہوئی تو ہم اسی میجر کے سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔ میرے خاوند نے بچّی کو دیکھا تو اُس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ مجھ سے پوچھا— 'یہ بچّی میری نہیں ہو سکتی'۔— اس آدمی پر میرا رُعب چلتا تھا۔ میں نے اسے بہت بُری گالیاں دیں، حالانکہ وہ سچا تھا۔ میں نے اسے منوا لیا کہ یہ اُسی کی بچّی ہے ....

"صاحب کی مَیم آچکی تھی۔ اُس کے دو بچّے تھے۔ صاحب ٹھیک کہتا تھا مَیم بہت بھدّی تھی۔ میری بچّی چھ سات ماہ کی ہوئی تو ایک روز میں اُسے اُٹھائے بنگلے میں چلی گئی۔ میم صاحب نے پہلی بار میری بچّی کو دیکھا۔ اُس نے مجھے مبارک باد دی اور خوشی کا اظہار کیا مگر اُس نے بچّی کو دیکھا تو چونک کر مجھے دیکھا۔ غصّے میں بولی— 'یہ بے بی تم کدھر سے لایا؟'— میں نے جواب دیا کہ میری اپنی بچّی ہے۔ اُس نے مجھے گالیاں دیں۔ وہ طبیعت کی غصیلی تھی۔ اندر گئی اور صاحب کے ساتھ اپنی زبان میں لڑنے لگی۔ اُسی روز اُس نے مجھے اور میرے خاوند کو نوکری سے جواب دے دیا۔ میرے خاوند کو پتہ نہ چل سکا کہ کیا وجہ ہے۔ ہمیں مَیم نے جواب دیا تھا۔ صاحب باہر نہیں آیا۔ میم نے کہا کہ کوارٹر فوراً خالی کرو۔ ہم وہاں سے نکل گئے۔ کچھ دن خراب ہوئے،

پھر ایک جگہ نوکری ملی۔ یہ صاحب بھی ویسا ہی تھا جیسا پہلا تھا میں اب سنبھل گئی تھی۔ ایک غلطی کی سزا بھگت کر ویسی ہی دوسری غلطی نہ کی۔ نوکری چھوڑ کر ہم اس گاؤں میں آ گئے۔ محنت مزدوری کرتے رہے۔ میرے خاوند نے کھیتی باڑی سیکھ لی۔ وہ شروع میں کہتا رہا کہ انگریزوں کی نوکری میں جو مزے ہیں وہ اور کہیں نہیں لیکن میں بھوکی مرنے کو تیار تھی انگریزوں کی نوکری منظور نہیں تھی۔ خدا نے میری وہ ایک بھول جو میں نوجوانی کی نادانی میں کر بیٹھی تھی ابھی تک معاف نہیں کی۔ اپنے خاوند کو دھوکہ دینے والی عورت کو خدا معاف کیا ہی نہیں کرتا۔ یہ لڑکی آج تک میرے لئے سزا بنی ہوئی ہے۔"

وہ بہت روئی۔ انگریز افسروں کے اخلاق کو اور ان کے ہندوستانی نوکروں کی مجبوریوں کو ہم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو ایک انگریز نے ایک غریب ہندوستانی لڑکی کو خراب کیا تھا، میں ایسے انگریز فوجی افسروں کے نام بتا سکتا ہوں جن کی میموں نے اپنے فوجی اردلیوں کے ساتھ آشنائی کر رکھی تھی۔ ان میں تین پنجابی اور ایک پٹھان تھا۔ انگریزوں کی اخلاقی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔

"تم تو اپنے خاوند کی طرح اس وہم کو نہیں مانتی ہو گی کہ یہ لڑکی کسی جن کی اولاد ہے" — میں نے کہا — "کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو کہ یہ لڑکی تمہارے گھر سے چلی جائے تو تمہارے ہاں اولاد ہو گی؟"

وہ پسماندہ ذہن کی عورت تھی اس لئے پیر کے خلاف کوئی بات

سُننے یا کہنے سے ڈرتی تھی لیکن وہ پیروں کے احترام اور حقیقت کے درمیان پھنسی ہوتی نظر آتی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا۔ "سرکار (پیر حکیم صاحب) کا کہنا سر آنکھوں پر۔ انہیں غیب سے اشارے ملتے ہیں، لیکن یہ لڑکی جس کی اولاد ہے وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اگر سرکار نے کہا ہے کہ اولاد ہو گی تو شاید ہو جائے، مجھے اس خاوند کی اولاد کی امید نہیں۔ اگر اس کی اولاد ہونی ہوتی تو اکیس بائیس سالوں میں ایک بچہ تو ضرور ہوتا۔"

"لڑکی کہاں ہو گی؟"

وہ قسمیں کھانے لگی کہ اُسے معلوم نہیں۔ اسے وہ پیر کے گھر چھوڑ آتے تھے۔ میں نے زمیندار کا نام لے کر پوچھا کہ اُس کے ساتھ لڑکی کے تعلقات کیسے تھے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ لڑکی اُسے پسند کرتی ہو اور لڑکی کو اسی زمیندار نے پیر کے گھر سے اغوا کرایا ہو؟

"معلوم ایسے ہی ہوتا تھا جیسے وہ اس زمیندار کو پسند کرتی ہے" — اُس نے جواب دیا — "اُس کے تحفے، کپڑے اور روپیے ہنسی خوشی لے کے رکھ لیتی تھی۔ وہ راتوں کو باہر نکل جاتی تھی تو مجھے یقین ہوتا تھا کہ زمیندار کہیں جنگل میں آیا ہے اور یہ اُسے ملنے گئی ہے۔"

"تم لڑکی سے ڈرتی ہو؟"

"بہت ڈرتی ہوں" — اُس نے جواب دیا — "وہ ہماری سُنتی ہی نہیں۔"

میرا مسئلہ — لڑکی؟ گھوڑی؟ یا قتل؟

اُس سے کچھ اور باتیں پوچھیں۔ کچھ باتیں اُسے سمجھائیں اور میاں بیوی کو گھر بھیج دیا۔ میرے سامنے بڑا ہی پیچیدہ مسئلہ تھا۔ یہ نہ گھوڑی کی چوری کا تھا نہ لڑکی کی گمشدگی کا، یہ رلامے کھوجی کے قتل کا مسئلہ تھا۔ میں نے فرض کر لیا تھا کہ کسی جرائم پیشہ گروہ کی واردات ہے۔ میرے ذہن میں بار بار مینا اور لسا کھا آتے تھے۔ عثمان کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتے ہوئے مجھے یہ امکان نظر آنے لگا کہ یہ واردات اس پیر کی ہے۔ پیر کے پاس بھی جرائم پیشہ آدمی تھے جن کے ہاتھوں وہ رلامے کو قتل کرا سکتا تھا۔ مجھے یہ امکان بھی نظر آیا کہ واردات زمیندار کی ہے۔ وہ بھی اپنی حیثیت کے رُعب اور پیسے کے زور سے قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرا سکتا تھا۔ ان امکانات کو دو چیزیں رد کرتی تھیں۔ ایک یہ کہ پیر کے گھر سے لڑکی غائب ہوئی تھی اور زمیندار کے گھر سے گھوڑی چوری ہو گئی تھی۔

اس گورکھ دھندے کو سیدھا کرنے کے لئے زمیندار اور پیر سے ملنا بہت ضروری ہو گیا۔ ان کے سینوں سے راز نکالنا بڑی اُستادی کا، بلکہ مداریوں جیسا کام تھا۔ میں جس وقت لڑکی کے ماں باپ کے ساتھ مصروف تھا اس دوران عثمان نے یہ انتظام کر دیا تھا

کہ علاقے کے تمام مخبروں کو ہدایات بھیج دی تھیں کہ مینا اور لمبا کھے کی اطلاع دیں۔ ان کا کوئی بھی آدمی جہاں کہیں نظر آجائے تھانے میں جلد از جلد اطلاع دیں۔ جرائم پیشہ گروہوں کے سرغنوں کی تلاش کا طریقہ اور ذریعہ صرف مخبر ہوتے تھے۔ اس کے لئے آج تک کوئی سائنسی طریقہ ایجاد نہیں ہوا۔ عثمان کے علاقے کے بعض سزا یافتہ جرائم پیشہ آدمیوں کو تھانے حاضری دینے کے لئے کانسٹیبل بھیج دیتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو چھوٹی موٹی وارداتیں بھی کرتے رہتے اور پولیس کے لئے مخبری بھی کرتے تھے۔ پولیس کی طرف سے انہیں یہ صلہ ملتا تھا کہ کبھی کچھ رقم دے دی جاتی یا کسی کی ایک آدھ واردات کی تفتیش گول کر دی جاتی تھی۔

میں نے گھوڑے پر ایک کانسٹیبل کو زمیندار کے گاؤں اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ فوراً تھانے آجائے۔ وہ جب آیا رات ہو چکی تھی۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔ "آپ کو گھوڑی چاہیئے؟"

"ہاں ہاں!" اس نے بیتاب ہو کر پوچھا۔ "مل گئی ہے؟"

"جونہی آپ لڑکی لا دیں گے میں آپ کی گھوڑی آپ کو دے دوں گا۔"

"لڑکی؟" اس نے حیران سا ہو کے پوچھا۔ "کون سی لڑکی؟"

"نیلی آنکھوں والی۔"

وہ بُجھ سا گیا۔ کہنے لگا کہ اس لڑکی کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا۔

"کیا میں وہ تمام کپڑے اور پیسے آپ کے سامنے رکھ دوں جو آپ لڑکی کو اس کے گاؤں میں جا کر دیتے رہے ہیں؟" میں نے کہا اور اُس کے چہرے کے تاثرات کی تبدیلی دیکھنے لگا۔ تبدیلی بڑی صاف تھی۔ کیا آپ سچے دل سے اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے؟ — اُسے خاموش دیکھ کر میں نے کہا — "آپ بہت کچھ جانتے ہیں۔ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے جو پولیس کے محکمے کا قیمتی آدمی تھا۔ میں آپ کو مشتبہ بنا کر حوالات میں بند کر سکتا ہوں۔"

اُسے اچانک یاد آ گیا کہ وہ اُونچی حیثیت کا آدمی ہے اور انگریزوں کا منظورِ نظر۔ بولا — "آپ نے ایک تو مجھے بے وقت بلایا ہے، دوسرے کر آپ مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اپنی نوکری کو خطرے میں ڈالیں۔ میری اتنی قیمتی گھوڑی چوری ہو گئی ہے اور آپ مجھے ایک لڑکی کے ساتھ وابستہ کر رہے ہیں۔"

"اور میں آپ کو راسے کھوجی کے قتل کے جرم میں شاملِ تفتیش کرتا ہوں" — میں نے تھانیداروں کے لہجے میں کہا — "میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دیں.... کیا آپ لڑکی کے گھر نہیں جاتے تھے؟"

وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا — "کیا آپ رات کو لڑکی کے گاؤں کے باہر لڑکی سے چوری چھپے نہیں ملتے تھے؟"

"نہیں" — اس نے تڑپ کر جواب دیا — "میں کبھی رات کو اُسے ملنے نہیں گیا تھا۔"

"دن کو جاتے تھے؟"

اُس نے ذرا سوچ کر جواب دیا — "ہاں۔ میں دن میں چند ایک بار گیا ہوں" — وہ مسکرایا۔

میں نے اپنا رویّہ کچھ نرم کر لیا۔ کچھ باتیں اُس نے بتائیں، کچھ میں نے پوچھیں۔ اُس نے کوئی پردہ نہ رہنے دیا۔ اس نے لڑکی کے ماں باپ کے بیان کی تصدیق کر دی۔ وہ یہ بھی مان گیا کہ اس کی اور پیر کی رقابت بھی اور عداوت بھی۔ اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ وہ لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو اسے پھانسنے کے ڈھنگ تھے۔ وہ اس لڑکی کی خاطر اس کے ماں باپ کو زمین کا ایک ٹکڑا دینے کو تیار تھا۔

"لڑکی آپ کو پسند کرتی تھی؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "وہ نہ مجھے پسند کرتی تھی نہ پیر کو۔"

"آپ نے کیسے معلوم کیا؟"

"اُس نے مجھے کبھی دھتکارا نہیں تھا" — اُس نے جواب دیا — "میرے تحفے اور کپڑے اور پیسے خوشی سے لے لیتی تھی لیکن مجھے وہ ہاتھ دُور ہی رکھتی تھی۔ میں صاف سمجھ جاتا تھا کہ یہ مجھے قبول نہیں کر رہی۔ لڑکی بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔ میں اب محسوس کرنے لگا ہوں کہ میں اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا لیکن وہ مجھے انگلیوں پر نچاتی رہی۔۔۔۔ پیر سے تو وہ نفرت کرتی تھی۔"

"میرا خیال ہے وہ رات کو کبھی کبھی آپ کو گاؤں سے باہر ملتی تھی" — میں نے کہا — "آپ اُسے دن کو بتا دیتے ہوں گے کہ آپ فلاں رات فلاں جگہ آئیں گے۔"

"میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے" — اُس نے کہا — "یہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ مجھے رات کو ملتی تھی یا نہیں۔ میں نے اسے دو تین بار کہا تھا کہ میں رات کو آؤں گا۔ آپ یقین جانیں اُس نے ہر بار یہی جواب دیا تھا کہ دن کو آجایا کریں، رات والی بات دل سے نکال دیں۔"

لڑکی کے باپ نے مجھے بتایا تھا اور ماں نے بھی کہ لڑکی کبھی کبھی رات کو باہر جاتی اور دیر سے آتی تھی۔ دونوں کو یقین تھا کہ رات کو یہ زمیندار کسی جگہ آتا ہے۔ میں نے بھی یہی رائے قائم کی تھی لیکن زمیندار کہہ رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ لڑکی جاتی ضرور تھی میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ وہ کس کے پاس جاتی تھی؟ اُس سے ملنے کون آتا تھا؟ کیا وہ آدمی یہی تو نہیں جس کے ساتھ لڑکی پیر کے گھر سے بھاگ گئی ہے؟ پھر وہی سوال سامنے آ گئے کہ گھوڑی کون لے گیا؟ رامے کو کس نے قتل کیا؟

"میں نے یہ سوچا ضرور تھا کہ لڑکی ہاتھ نہ آئی تو اسے اغوا کرا لوں گا" — زمیندار نے کہا — "لیکن اُس پر پیر نے قبضہ کر لیا۔ لڑکی کے فرار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کا دل کہیں اور تھا اور وہ اُس آدمی کے

ساتھ چلی گئی ہے۔"

"لڑکی جائے جہنم میں"۔۔۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔"مجھے رلمے کھوجی کا قاتل مطلوب ہے۔ کیا آپ میری یہ مشکل حل کر سکتے ہیں؟"

"میں نے بہت سوچا ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔"وہ میری گھوڑی کے کھُرے پر جا رہا تھا۔ آپ بتاتے ہیں کہ لڑکی اسی گھوڑی پر گئی ہے۔ یہ مشکل پِیر حل کر سکتا ہے۔"

میں نے اپنے انداز کی پُوچھ گُچھ کی۔ یہ شخص مجھے صاف نظر آیا۔

میں جنّات کے دربار میں گیا

میں اگلے روز پِیر کے ہاں گیا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اپنے اُوپر جلالی کیفیت طاری کر لی۔ میں اُس کے قریب بیٹھا۔ مریدوں کی طرح سلام کیا۔ وہ مراقبے میں چلا گیا۔ میں دانستہ خاموش بیٹھا رہا۔ مجھ پر اُس کا تقدّس طاری ہُوا نہ رعب۔

"میرے پاس کیوں آتے ہو؟"۔۔۔ اُس نے آنکھیں بند کیے ہوئے کہا۔۔۔"میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ میرے ایک آدمی نے تمہاری سفارش کی ہے کہ تم شریف آدمی ہو، ورنہ تمہارا انجام بہت بُرا ہوتا۔ تم میری غیر حاضری میں میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل ہوئے پھر جُوتوں سمیت اس درگاہ کی چھت پر گئے۔ تم نے یہ

نہیں دیکھا کہ حضرت سلیمان کی اُمّت (جنّات) نیچے قرآن پڑھ رہی تھی۔ پھر میرے چار آدمیوں کو اپنے ساتھ لے گئے.... یاد رکھو، اس علاقے میں انگریزوں کی حکومت نہیں ہے۔ کہو تو ایسا جن پیچھے ڈال دوں کہ ساری عمر تڑپتے گزار دو۔ خوش قسمت ہو کہ مسلمان ہو۔"

مجھے اس پر جو غصہ آیا اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے لیکن میں غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بجائے میں نے اس سے معافی مانگی اور کہا۔ "یا سرکار! میری نوکری کا سوال ہے۔ آپ کے قبضے میں جن اور چڑیلیں ہیں۔ ان سے پوچھیں گھوڑی کہاں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ گھوڑی کا مالک بہت بڑا زمیندار اور حکومت کا آدمی ہے۔ میری رپورٹ کر دے گا اور میں مارا جاؤں گا۔"

اُس نے لمبا سانس لیا جو شاید اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اُس نے گردن اکڑا لی اور آنکھیں کھول کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے جلالی انداز میں بولا۔ "پرسوں اسی وقت دربار میں پھر حاضری دو۔ ہم تمہیں بتائیں گے گھوڑی کس کے پاس ہے.... جاؤ چلے جاؤ۔"

"سرکار!" — میں نے جاہل قسم کے معتقدوں اور مریدوں کے لہجے میں التجا کی — "دو باتیں اور بھی اپنے جنات سے پُوچھنا۔ ایک یہ کہ آپ کی چھت سے جو لڑکی رتے سے اُتر کر فرار ہوتی ہے وہ کہاں ہے اور راما کھوجی کا قاتل کون ہے؟"

وہ اس طرح بدکا جیسے اُسے کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔ کچھ دیر آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتا رہا پھر آگے جھک کر سرگوشی میں مجھ سے پوچھا —

"راما کھوجی قتل ہو گیا ہے؟"

"آپ کو کسی نے نہیں بتایا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا۔

میں سوچنے لگا، کیا اس شخص کو واقعی علم نہیں کہ راما قتل ہو گیا ہے؟ قتل اس کی بستی سے دُور ہوا تھا۔ میں جاتے واردات پر دوسری طرف سے گیا تھا۔ شاید اسے معلوم نہ ہو سکا ہو۔ پولیس کہیں جاتی تھی تو ہر طرف خبر پھیل جاتی کہ فلاں جگہ پولیس گئی ہے۔ ڈاکے اور قتل کی وارداتوں کی خبریں بھی اسی طرح پھیلا کرتی تھیں۔ میں حیران تھا کہ پیر کو رامے کے قتل کی اطلاع نہ ملی۔ اس سے مجھے شک ہوا کہ یہ اس قتل میں ملوث ہے لیکن اُسی شام اُس کے خاص آدمی نے، جسے میں نے اپنا مخبر بنا لیا تھا، مجھے بتایا کہ پیر کو واقعی معلوم نہ تھا کہ راما قتل ہو گیا ہے۔ لڑکی کے فرار نے اسے باؤلا کر دیا تھا۔ وہ غصے میں تھا اور بے تحاشہ شراب پیتا رہا تھا۔ نشے میں دُھت ہونے کی وجہ سے وہ تھانے میں مجھ پر غصہ جھاڑنے نہیں آیا تھا۔ نہ اُسے اتنا ہوش تھا کہ مجھے اپنے ہاں بُلا کر گلہ کرتا کہ میں نے اُس کی غیر حاضری میں اُس کی اجازت کے بغیر داخل ہو کر اُس کے دربار کی بے ادبی کی ہے۔

رامے کھوجی کے قتل کی خبر سُن کر اُس کا تاثر بدل گیا تھا۔ اُس

وقت میں یہی سمجھا کہ راسے کو اسی نے قتل کرایا ہے۔ میں نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔ اُس نے پھر اپنے اوپر جلال اور مراقبے والی کیفیت طاری کر لی۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ذرا سا ہلایا۔

جنّات غائب، پیر حاضر

"سرکار!" — میں نے کہا — "ہوش میں آئیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس نشے سے نکلیں کہ یہاں انگریزوں کی بادشاہی نہیں ہے۔ انگریز آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں آپ کیا ہیں۔"

اُس نے آنکھیں کھول دیں اور عام آدمی کی طرح مجھے دیکھا۔ میں نے کہا "میں نے آپ کی عزّت کی ہے کہ یہاں آگیا ہوں۔ میں آپ کو تھانے بلا سکتا تھا۔ انگریزوں کا ایک قیمتی کھوجی قتل ہو گیا ہے۔ آپ نے ایک غریب ماں باپ کو ڈرایا، ورغلایا، انہیں لالچ دیتے اور دھوکے سے اُن کی کنواری بیٹی کو اپنے گھر میں حبسِ بے جا میں رکھا" — وہ سُن رہا تھا اور اُس کے چہرے پر رنگ آ اور جا رہے تھے۔ میں نے اُس کے پاؤں سے زمین نکالنے کے لئے کہا — "میں جانتا ہوں، پولیس کپتان جانتا ہے کہ آپ کی اس درگاہ میں جوان لڑکیوں کا کاروبار ہوتا ہے۔ آپ نے گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والی لڑکی کو آگے

چلایا اور اس طرح چلایا جیسے وہ رستے سے خود اُتر کر فرار ہوتی ہے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس لڑکی میں انگریزوں کا ایک سفید پوش اور زمیندار بھی دلچسپی لیتا ہے۔ آپ غلط کہتے ہیں کہ رامے کے قتل سے آپ بے خبر ہیں!"

"یہ جھوٹ ہے"۔۔۔ وہ تڑپ کر بلبلا اُٹھا۔ میں اُسے اسی کیفیت میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "ملک صاحب! آپ اُس حرام خور (اور ننگی گالیاں) کی باتوں میں آ گئے ہیں۔ یہ الزام غلط ہیں جو آپ نے مجھ پر تھوپے ہیں"

"پھر سچ کیا ہے؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ "یہ الزام غلط ہیں تو صحیح کیا ہے؟" ۔۔۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ چونکہ مجرم ذہنیت کا آدمی تھا اس لئے اُس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ اپنی اصلیت میں آنے لگا۔ گناہ چھوٹا سا ہو یا بہت بڑا، انسان کی اخلاقی جرأت کو ختم کر دیتا ہے۔ میں نے اُسے رازداری کے لہجے میں کہا ۔۔۔ "آپ جو کچھ بھی ہیں، میری نظر میں مسلمان ہیں۔ ہم کفرستان میں ہیں۔ اگر میں آپ کو مشتبہ بنا کر تھانے بلا لوں اور برآمدے میں بٹھا دوں تو ہندو، سکھ اور عیسائی ہمارے مذہب کا مذاق اُڑائیں گے اور کہیں گے کہ وہ دیکھو مسلمانوں کا پیر کس جرم میں تھانے بیٹھا ہے۔ میں آپ کے پاس اس طرح آیا ہوں جس طرح مرید آیا کرتے ہیں۔ میں جو پوچھتا ہوں صحیح صحیح بتا دیں۔ میں آپ پر پردہ ڈالے لینے کی پوری کوشش کروں گا۔ اگر آپ گول گول باتیں کر

کے مجھے ٹالنے کی کوشش کریں گے تو آپ کی عزت کرنا چاہوں تو بھی نہیں کر سکوں گا۔ میری ڈیوٹی ہی ایسی ہے" — میں نے اور آگے جھک کر کہا — "اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سرکار اندر سے کیا ہیں۔ میں اُس وقت اس درگاہ پر چھاپہ ماروں گا جب آپ نشے میں بدمست ہوں گے اور آپ کے گھر سے وہ عورتیں برآمد ہوں گی جنہیں اس گھر میں نہیں ہونا چاہیئے۔ انگریز خود بدکار قوم ہے اس لئے بدکاروں کو پہچانتی ہے۔"

"ارے چپ ہو جاؤ ملک بھاتی!" — اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور دوستانہ بے تکلفی سے بولا — "میرا تعلق صرف اس لڑکی کے ساتھ تھا۔ وہ سالی بھاگ گئی ہے۔ مجھے شک ہے اس زمیندار نے اُسے بھگایا ہے۔"

"مجھے اس لڑکی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے" — میں نے کہا — "مجھے زمیندار کی گھوڑی کے ساتھ بھی دلچسپی نہیں رہی۔ تحقیقات ہوتی رہے گی۔ گھوڑی نہ ملی تو کیس عدم پتہ کر کے داخل دفتر کر دوں گا۔ مجھے راما کا قاتل چاہیئے۔ مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ راما گھوڑی اور چور کا کھرا اُٹھاتے قتل ہوا ہے، اور آپ کے پچھواڑے کی دیوار پر جو نشان ہیں اور لڑکی کا جو کھرا ہے، وہ صاف بتاتا ہے کہ وہ چوری کی گھوڑی پر گئی ہے، اس لئے مجھے گھوڑی اور لڑکی کے متعلق بھی معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ کا اس لڑکی کے

ساتھ کیا تعلق تھا اور کیا وہ بھاگی ہے یا یہ کوئی ڈرامہ تھا یا کیا تھا۔"

پردوں کے پیچھے

اُس نے بغلیں جھانکنے کی کوشش کی۔ انسانی فطرت کے مُطابق اقبالِ جُرم کے ساتھ ساتھ پردہ پوشی کا عمل بھی جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن میری اُستادی نے اُس کی زبان رواں کر دی۔ میں اُس کا سارا بیان آپ کو نہیں سُنا رہا کیونکہ یہ اصل کہانی سے بھی لمبا ہے۔ اس کے اہم حِصّے سُنا دیتا ہوں۔ اُس کے الفاظ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور میں اپنی سادہ لوح قوم کو بتانا چاہتا ہوں کہ اکثر پیر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ اُس نے کہا تھا — "آپ جانتے ہیں کہ اس پیری مریدی کی حقیقت کیا ہے۔ لوگ مجبور اور بیوقوف ہوتے ہیں اور ہم چالاک اور نوسرباز۔ جو پیر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کے قبضے میں جنّ ہیں اُسے میرے سامنے بِٹھا دیں۔ میں اُسے بتاؤں گا کہ ایسے ہی جنّ میرے قبضے میں بھی ہیں۔ یہ سب دھوکہ بلکہ نظر کا دھوکہ ہے.... اور اولاد دینے والے پیر بے اولاد عورتوں کو جو اولاد دیتے ہیں وہ اولاد دعاؤں یا تعویذوں کی نہیں وہ پیر کی ہوتی ہے۔ لوگ اتنے احمق ہیں کہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اولاد دینے والا پیر صرف عورت پر عمل کرتا اور اُسی کو تعویذ دیتا ہے، وہ خاوند کے

ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اُس کی دلچسپی صرف عورت کے ساتھ ہوتی ہے۔"

اُس نے نیلی آنکھوں والی لڑکی کے ساتھ جس طرح تعلق پیدا کیا تھا وہ بھی تفصیل سے سُنایا۔ اُس نے جھوٹ نہیں بولا۔ لڑکی کے باپ اور اُس کی ماں نے جس طرح بیان دیئے تھے، پیر نے اسی طرح اپنا بیان دیا۔ اُس نے زمیندار کا بھی ذکر کیا۔ "لڑکی اس قدر ہوشیار نکلی کہ ہاتھ نہیں آتی تھی" — اُس نے کہا۔ "میں نے اپنے کمرے میں لے جا کر اُسے اپنے عمل کی جادوگری سے زیر کرنے کی کوشش کی تو وہ زندہ مچھلی کی طرح میرے ہاتھ سے پھسل کر نکل گئی۔ کہنے لگی یہ جادو کسی اور پر چلانا۔ میں ایسی ہوتی تو بڑے بڑے خوبصورت اور امیر آدمی میرے پیچھے پھرتے ہیں، میں کسی پر لعنت بھی نہیں بھیجتی اور وہ میرے ہاتھ سے نکل گئی...... اُس کے ماں باپ کو ڈرایا دھمکایا تو ایک روز وہ اُسے میرے پاس لے آئے۔ میں اُسے اندر لے گیا اور اُسے کہا کہ میری نیت بُری نہیں۔ میں نے دوسرے کمرے میں جا کر کلوروفارم کی شیشی نکالی۔ چند قطرے رومال پر ڈال لیے۔ رومال چھپا کر لایا۔ لڑکی میرے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ فوراً بے ہوش ہو گئی۔"

اُس کے ماں باپ دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ پیر نے اُنہیں اسی طرح چلتا کیا جس طرح ان دونوں نے مجھے سنایا تھا۔ پیر نے

اپنے بیان میں کہا ”لڑکی شام سے ذرا پہلے ہوش میں آئی۔ اس نے اُودھم مچا دیا۔ کئی ڈھنگ کھیل کر اُسے خاموش کرایا۔ بعد میں ڈرایا، لالچ دیئے، دھمکیاں دیں مگر اُس پہ کچھ اثر نہ ہوا۔ میری خاص مریدنیوں میں ایک خرانٹ اور اُستاد عورت ہے، اُسے بلایا اور کہا کہ اسے رام کرو۔ میں نے لڑکی کے کمرے میں جانا چھوڑ دیا۔ لڑکی اس عورت کی تحویل میں رہی۔ سات آٹھ روز گزر گئے۔ اس عورت نے مجھے خوشخبری سُنائی کہ لڑکی نرم ہو رہی ہے اور مجھے قبول کر لے گی، مگر ایک صبح مجھے بتایا گیا کہ لڑکی غائب ہے اور پچھواڑے ایک رسّہ لٹک رہا ہے۔ میں نے جا کر دیکھا۔ رسّہ لٹک رہا تھا۔ اُوپر کا سرا مُمٹی سے بندھا تھا“

”میں اس عورت سے ملنا چاہتا ہوں“ — میں نے کہا۔

”وہ بھی چلی گئی ہے“ — اُس نے جواب دیا — ”اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی کو اُسی نے بھگایا ہے۔ اگر وہ یہاں رہتی تو میں اُسے زندہ نہ چھوڑتا۔“

”میں کیسے یقین کروں کہ وہ خود غائب ہوئی اور اُسے آپ نے مروا نہیں دیا؟“ — میں نے پوچھا — ”وہ کہاں کی رہنے والی تھی؟“

”ایسی عورتیں کہیں کی بھی رہنے والی نہیں ہوتیں“ — اُس نے جواب دیا — ”اُس کا پیشہ ہی یہی تھا، لڑکیوں کو ورغلانا اور مریدنیوں میں اضافہ کرنا۔ یہ عورت دو سال سے میرے پاس تھی۔ ہر ڈھنگ کھیلنا جانتی تھی۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے لئے گھر بھیدی کا کام کرتی تھی۔

میرے پاس آتی تو میں نے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اُس نے باہر اپنا کاروبار بھی جاری رکھا اور میرے کام بھی کرتی رہی۔ مجھے بالکل علم نہیں کہ کہاں کی رہنے والی ہے۔"

یہ عورت بھی گئی

اس عورت کی اب مجھے ضرورت تھی۔ میں نے پیر سے بہت پُوچھ گچھ کی لیکن وہ جو کچھ بتا چکا تھا اس سے زیادہ اُس سے کچھ اور معلوم نہ ہو سکا۔ صرف ایک چیز اُس نے مجھے اندر سے منگوا کر دے دی۔ یہ رسّہ تھا جس سے نیلی آنکھوں والی لڑکی چھت سے اُتری تھی۔ پیر نے بتایا کہ یہ رسّہ اُس کے گھر کا نہیں باہر سے آیا ہے۔ یہ شاید اسی مقصد کے لئے لایا گیا تھا۔ یہ عورت اس واردات کا نیا کردار تھا۔ میرے دماغ میں یہی آتا تھا کہ یہ عورت اس لڑکی کو اُڑا لے گئی ہے اور کسی امیر کبیر آدمی یا کسی راجے مہاراجے کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے۔ میرے سامنے سب سے زیادہ پیچیدہ سوال یہ تھا کہ اس لڑکی اور اسے بھگا لے جانے والی عورت کا پیچھا کروں یا رامے کھوجی کے قاتل تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ اختیار کروں؟ مجھے اب یہ نظر آنے لگا تھا کہ گھوڑی اس لڑکی کو بھگا لے جانے کے لئے چُرائی گئی ہے۔ پیر نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ یہ عورت چوروں اور ڈاکوؤں کے لئے کام کرتی تھی۔ میں

اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی عورتیں جرائم پیشہ گروہوں کے لئے کیا کیا کام کرتی ہیں اور کس طرح کرتی ہیں۔

میں جب پیر کے گھر سے نکلا تو اُس کا وہ خاص آدمی جس نے مجھے پیر کے گھر کے راز دیئے اور میرا مُخبر بن گیا تھا، باہر کھڑا تھا۔ وہ میرے انتظار میں تھا۔ میں اُسے اشارہ کر کے چلا گیا۔ وہ دُور کا چکر کاٹ کر مجھے راستے میں ملا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ لڑکی ایک بدمعاش عورت کی تحویل میں رہی ہے اور وہ عورت بھی لڑکی کے ساتھ ہی غائب ہو گئی ہے؟ اُس نے یہ نہ بتانے کی کچھ وجوہات بتائیں جو کچھ ایسی ویسی ہی تھیں۔ البتہ اُس نے یہ کہا کہ اُسے بالکل علم نہیں تھا کہ لڑکی اس عورت کی تحویل میں ہے۔ یہ بند کمروں کی باتیں تھیں جو اس آدمی کو معلوم نہیں تھیں۔

"یہ تو آپ کہتے ہیں کہ آپ پیروں کی اصلیت جانتے ہیں" — اُس نے کہا — "لیکن اس پیر کی حویلی کے اتنے کمرے ہیں اور اس کے پاس ایسے ایسے آدمی اور عورتیں ہیں کہ خود پیر کو معلوم نہیں کہ اس کے گھر میں کیا ہوتا ہے۔"

میں نے اس آدمی سے اس عورت کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بھی وہی باتیں بتائیں جو پیر بتا چکا تھا۔ اُسے بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت کہاں کی رہنے والی تھی۔ اُسے یہ یقین تھا کہ یہ عورت جرائم پیشہ گروہوں سے تعلق رکھتی تھی اور بہت ہی چالاک عورت تھی۔ پیر کو بھی انگلیوں

پر بچا لیتی تھی۔۔۔۔ اس آدمی کے پاس اور کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ اس کی اطلاع کے مطابق ان دو تین دنوں میں پیر کہیں باہر نہیں گیا تھا نہ کوئی مشکوک آدمی اس کے پاس آیا تھا۔ پیر غصّے میں شراب چڑھاتا اور گالیاں بکتا رہا تھا۔

قتل کی کہانی پھر سُنی

میں شام کے بعد تھانے میں بیٹھا خیالوں میں سر پٹخ رہا تھا۔ یہ ایسی واردات معلوم نہیں ہوتی تھی جس کی تفتیش میری اپنی ہی سراغرسانی سے مکمل ہو جاتی۔ مجھے اب مُخبروں کا سہارا لینا تھا۔ پیر اور زمیندار کو بھی میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اندھیرے میں فرش پر گری ہوئی سُوئی تلاش کرنی تھی۔ عثمان آگیا۔ مجھ پر گہری سوچ اور شاید افسردگی طاری تھی۔ عثمان مُسکراتا ہُوا آیا۔ وہ میرے دل کا حال جانتا تھا اور میری ذمہ داریوں کو بھی سمجھتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ شہروں میں قتل کی جو وارداتیں ہوتی ہیں ان کا سراغ لگا لیا جاتا ہے۔ رات سڑک پر پڑی ہوئی لاش ملے تو اُس کے وارثوں کو تلاش کر کے اُن کے قاتل کو بھی پکڑا جا سکتا ہے مگر میرے سامنے ایسی واردات تھی جس کی تفتیش کے تمام راستے اندھیروں میں جا کر ختم ہو جاتے تھے۔ اگر رامے کھوجی کو

کسی جرائم پیشہ گروہ نے قتل کیا تھا تو یہ کون سا گروہ تھا؟ سہارا صرف مخبروں کا لینا تھا مگر یہ خطرہ موجود تھا کہ مخبر دوغلے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ انگریز ڈی۔ ایس۔ پی کا دورہ آٹھ دس روز تک متوقع تھا۔

میری اس پریشانی کو جانتے ہوئے عثمان مسکراتا ہوا آیا جیسے ہم نے تفتیش کامیابی سے مکمل کر کے ملزم پکڑ لیے ہوں۔ اُس نے میرے سامنے بیٹھ کر کہا — "جناب عالی! نیلی آنکھوں والی لڑکی خدا نے آپ کی تختی پر لکھی ہی نہیں۔ یہ تفتیش مجھے آزادی سے کرنے دیں۔ ہائے گورے گورے گال اور نیلے نیلے نین۔"

اپنی زندگی کی وہ شام مجھے آج تک یاد ہے۔ عثمان کی مسکراہٹ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اُس کا طفلانہ سا انداز بڑا ہی پیارا ہوا کرتا تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں عثمان کا یہ مذاق مجھے بُرا نہ لگا، بلکہ اچھا لگا۔ اعصاب تھک چکے تھے۔ میں اُس وقت بوڑھا نہیں تھا۔ میں نے عثمان کو چھیڑ دیا تا کہ وہ اور زیادہ مذاق کرے۔ میں نے اُسے کہا — "یار عثمان! سچی پوچھو تو اس وقت مجھے نیلی آنکھوں والی لڑکی چاہیئے۔"

"قتل ہو جاؤ گے ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "اخباروں میں خبر چھپے گی، ایک اے۔ ایس۔ آئی نے اپنے ایس۔ ایچ۔ او کو قتل کر دیا ہے۔"

کچھ دیر گپ شپ چلی جو آہستہ آہستہ واردات پر آ گئی۔ عثمان اتنا ہی سنجیدہ ہو گیا جتنا میں تھا۔ واردات کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے کرتے ہم دونوں پریشان ہی ہوتے گئے۔ عثمان نے کہا۔ "شرفو کو بلا کر ایک بار پھر پوچھتے ہیں کہ راما کس طرح قتل ہوا تھا۔ وہ عقل مند کانسٹیبل ہے۔ اسے کہیں گے کہ وہ اس وقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاتے اور یاد کرے کہ وہ چاروں آدمی قد بُت کے کیسے تھے۔ اسے شاید کوئی کام کی بات یاد آ جائے۔ شرفو نے بتایا ہے کہ ان چاروں کے پاس ڈنڈے تھے۔ شرفو جھوٹ نہیں بولتا۔ ڈنڈے ہی ہوں گے لیکن ملک صاحب! اگر وہ مِنیا یا لبا کھیے کے یا کسی ایسے ہی جرائم پیشہ گروہ کے آدمی ہوتے تو ان کے پاس خنجر، چاقو، برچھیاں، یا تلواریں ہوتیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کے پاس پستول اور بندوقیں بھی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک یا دو آدمی چھپ کر شرفو کانسٹیبل کو بھی رامے کھوجی کے ساتھ ختم کر سکتے تھے۔ مجھے شک ہے یہ کسی جرائم پیشہ گروہ کے آدمی نہیں تھے۔"

میں نے اشرف علی کانسٹیبل کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور اُسے کہا کہ وہ رامے کھوجی کے قتل کا آنکھوں دیکھا حال ایک بار پھر سناتے اور ذہن پر زور دے کر یاد کرے کہ وہ کیسے تھے۔ اُس نے ایک بار سنائی ہوئی کہانی ایک بار پھر سنا دی۔ میں نے اُسے کہا۔ "شرفو! یہی کہانی ایک بار پھر سناؤ۔" میں نے اُس کے چہرے پر تبدیلی سی دیکھی۔ وہ کھسیانی

سی ہنسی ہنس پڑا۔ میں نے کہا "شرفو! قاتلوں کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ تمہیں کوئی چہرہ یاد آجائے۔ سناؤ، کیا ہوا تھا۔"

اُس نے ساری بات ایک بار پھر سنا دی۔ عثمان نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ اُس نے بھی وہی محسوس کیا تھا جو میں نے کیا تھا۔ اشرف علی کے تین بیانوں میں کچھ فرق تھا۔ ایک بار اُس نے کہا کہ اُس کے تعاقب میں تین آدمی دوڑے۔ دو بار اُس نے دو کہے۔

"رامے پر چاروں نے ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"جی۔ چاروں نے۔"

"تم کہتے ہو ان میں سے ایک نے تمہاری طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ اسے بھی ختم کر دو" — میں نے پوچھا — "تم اُسی وقت بھاگے تھے یا رامے پر ڈنڈے پڑنے سے پہلے یا بعد؟"

"اُنہوں نے جونہی رامے پر حملہ کیا میں بھاگ اُٹھا" — اُس نے جواب دیا۔

"تم نے دوڑتے دوڑتے سنا تھا کہ حملہ آوروں میں سے ایک نے کہا کہ اسے بھی ختم کر دو؟" — میں نے پوچھا۔

"جی۔ میں دوڑ رہا تھا۔"

"تمہیں اشارہ کیسے دکھائی دیا؟" — میں نے پوچھا — "تم نے کیسے جانا کہ اس آدمی نے تمہاری طرف اشارہ کیا تھا؟"

"وہاں میں ہی تھا"۔۔۔اشرف علی نے جواب دیا۔۔۔"اس نے اشارہ ضرور کیا ہو گا"۔

"دیکھو شرفو!"۔۔۔میں نے کہا۔۔۔"تم پرانے کانسٹیبل ہو۔ سب باتیں سمجھتے ہو۔ وہ رامے کو ختم کر کے تمہارے پیچھے دوڑے ہوں گے۔ اتنی دیر میں تم بہت دور نکل گئے ہو گے۔ تم نے مجھے اپنے بھاگنے کا جو راستہ دکھایا تھا وہاں چٹانیں تھیں۔ اتنی دیر میں تم چٹانوں میں چلے گئے تھے۔ اس کی وضاحت کرو۔ شاید میں سمجھنے میں غلطی کر رہا ہوں"۔

اشرف علی شکنجے میں

اس نے جو جواب دیا اس سے میں مطمئن نہ ہوا بلکہ عثمان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"رامے پر حملہ کتنے بجے ہوا تھا؟"۔۔۔عثمان نے پوچھا۔

"تین اور چار بجے کے درمیان"۔

"تم اس گاؤں میں کب پہنچے؟"۔۔۔عثمان نے تیزی سے پوچھا۔۔۔"صحیح جواب دینا۔ ہم نمبردار سے پوچھ لیں گے"۔

"سورج غروب ہونے کے بعد"۔۔۔اشرف علی نے جواب دیا۔

"گویا تم دو گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت دوڑتے رہے"۔۔۔میں نے کہا۔

"جی۔ دو گھنٹے۔"

"سیدھے گاؤں میں گئے تھے یا دُور کا چکر کاٹ کر؟" — عثمان نے پُوچھا۔

"سیدھا گیا تھا۔"

"اگر تم سیدھے گئے تھے اور مسلسل دو گھنٹے دوڑتے رہے تھے تو تم دس میل دُور چلے جاتے" — عثمان نے کہا — "وہ گاؤں وہاں سے صرف ڈیڑھ میل دُور ہے۔"

"اس سے آدھا وقت دوڑ کر تم سیدھے یہاں پہنچ سکتے تھے" — میں نے کہا۔

"تمہارے تعاقب میں کتنے آدمی دوڑے تھے؟" — عثمان نے پُوچھا — "اچھی طرح یاد کر لو۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بعد عثمان نے اور میں نے اُس پر اس طرح سوال کرنے شروع کر دیئے جیسے تیر چلائے جاتے ہیں۔ یہ پُوچھ گچھ کا خاص طریقہ ہوتا ہے۔ شرفو نے شک پیدا کر دیا تھا۔ ہم ایک ایک سوال گھما پھرا کر کئی کئی بار کرتے تھے۔ عثمان اُٹھا اور اشرف علی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اشرف علی کے سر پر پگڑی تھی۔ وہ کسی سوال کا جواب دے رہا تھا کہ عثمان نے اُس کی پگڑی سر سے اُتار کر پھینک دی۔ اُس کے بالوں کو مٹھی میں لے کر زور سے اوپر کھینچا۔ اشرف علی اُٹھا۔ عثمان نے جھٹکا دے کر اُسے اپنی

طرف کیا اور اُس کے ٹخنوں پہ اپنا پاؤں مار کر یا اڑنگا دے کر اشرف علی کو فرش پر ایسا گرایا کہ وہ چاروں شانے چت گرا۔ اس کے ساتھ ہی عثمان نے دو کانسٹیبلوں کو آواز دی۔ فوراً ہی عثمان اشرف علی کے سینے پر کھڑا ہو گیا۔

میں تشدّد کا قائل نہیں تھا۔ میں نے اُٹھ کر عثمان کا بازو پکڑا۔ عثمان نے سخت غصے میں اپنا بازو چھڑایا اور مجھے دھکّہ دے کر غضب ناک آواز میں بولا۔ "پیچھے رہو ملک صاحب! آپ کی شرافت ہمیں بہت خراب کر چکی ہے۔ آپ ہفتوں سراغرسانی کرتے رہیں گے، میں پانچ منٹ میں آپ کو رامے کے قاتل کا نام پتہ بتا دوں گا۔" اُس نے اشرف علی کے سینے پر اُچھلتے ہوئے اُسے گالی دی اور پوچھا۔ "فوراً بول ادتے! میں جب گھوڑی کی چوری کے موقعہ پر جانے کے لئے دوسرے کانسٹیبلوں کو ساتھ لے جا رہا تھا تو تم نے آگے ہو کر کیوں کہا تھا کہ میں جاؤں گا.... اور جب میں رامے کھوجی کے ساتھ دوسرے کانسٹیبل کو جانے کے لئے کہہ رہا تھا تو تم نے کیوں کہا تھا کہ رامے کے ساتھ میں جاؤں گا.... ملک صاحب! میرے قریب نہ آنا۔"

میں الگ کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں وہ دو کانسٹیبل آ گئے جنہیں عثمان نے آواز دی تھی۔ یہ اذیّت رسانی کے ماہر تھے۔ میرے دفتر میں گز لمبا ڈنڈا پڑا تھا۔ عثمان نے کہا، یہ ڈنڈا ادھر لاؤ۔ ڈنڈا اُس کے ہاتھ میں آیا تو عثمان نے اشرف علی کے سینے سے اُتر کر اُسے کہا۔ "منہ پورا کھول دو۔"

اشرف علی منت سماجت کرنے لگا۔ عثمان نے اُس کا مُنہ کھلوا لیا اور ڈنڈا درمیان سے اس کے مُنہ میں رکھ دیا۔ ڈنڈے کے دونوں سرے فرش سے اتنے ہی اُونچے تھے جتنا اشرف علی کا مُنہ اُونچا تھا۔ عثمان نے ایک پاؤں ڈنڈے کے ایک سرے پر اور دوسرا دوسرے پر رکھ کر دبا ڈالا۔ ڈنڈا اشرف علی کے ہونٹوں کے کونوں کو کاٹنے لگا۔ وہ بُری طرح تڑپا۔ ایک کانسٹیبل اُس کی رانوں پر کھڑا ہو گیا اور دوسرے نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر اس کے ہاتھوں پر پاؤں رکھ دیئے۔ یہ بڑی ہی ظالمانہ اذیت ہوتی ہے۔

لڑکا بغل سے نکلا

تین چار منٹ بعد عثمان نے اُس کے مُنہ سے ڈنڈا نکالا اور پُوچھا ——"بولو گے؟"—— شرفو نے ہاں میں سر ہلایا۔ اُسے اُٹھایا گیا۔ اُس نے کہا ——"انہیں (کانسٹیبلوں کو) باہر بھیج دو"—— دونوں باہر چلے گئے۔

"وعدہ معاف گواہ بنا لو"—— اشرف علی نے کہا۔

"بنا لیا"—— میں نے کہا۔

"دھوکا تو نہیں ہو گا؟"—— اس نے پُوچھا۔

عثمان نے پوری طاقت سے اُلٹا ہاتھ اُس کے مُنہ پر مارا۔ وہ پیچھے دیوار سے جا لگا۔ عثمان نے اسے گالی دے کر کہا ——"تم ہمیں اپنے جیسا

سمجھتے ہو۔ ملک صاحب نے کہا نہیں دیا تمہیں سلطانی گواہ بنالیا ہے۔ کرسی پر بیٹھو۔ کاغذ قلم دو ملک صاحب! میں بیان لکھتا ہوں۔"

"رامے کھوجی کو میں نے قتل کیا ہے"۔ اشرف علی نے کہا۔

"تمہاری اپنی دشمنی تھی یا کسی اور کے لئے قتل کیا ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"مینا کے لئے"۔ اس نے جواب دیا۔

"اب پوری بات سناؤ"۔ میں نے کہا۔ "ذرا سی بھی گڑبڑ ہوئی تو وعدہ معاف گواہ نہیں بن سکو گے اور پھانسی چڑھ جاؤ گے۔"

اُس کے بیان اور ہماری جرح سے اُس کا جو بیان بنا وہ یہ تھا:

مینا ایک اشتہاری اور پیشہ ور رہزن اور ڈکیت تھا۔ اُس زمانے میں ایسے افراد کو ٹھگ کہا کرتے تھے۔ مینا بڑی اچھی شکل و صورت اور چھریرے بدن والا آدمی تھا۔ وہ زندہ دل اور شگفتہ مزاج بھی تھا۔ اُسے دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص اتنا خطرناک مجرم ہے۔ رامے کھوجی کے قتل کے وقت اُس کی عمر میرے اندازے کے مطابق چونتیس پینتیس سال تھی۔ وہ قتل اور ڈاکے کی متعدد وارداتوں میں مطلوب تھا۔ میں اُس وقت تک مخبروں کی اطلاع پر تین چھاپے مار چکا تھا لیکن ہر بار مینا نکل گیا تھا۔ اُسے پولیس کے چھاپے کا قبل از وقت پتہ چل جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارے مخبر وہ غلط کردار ادا کرتے تھے اور دوسری وجہ یہ کہ اُس کے اپنے مخبر پولیس پر نظر رکھتے تھے۔

مینا نے یہ کمال کر دکھایا کہ میرے ایک کانسٹیبل کو اپنا باقاعدہ مخبر بنا رکھا تھا۔ یہ اشرف علی تھا جسے میں اور عثمان قابلِ اعتماد اور عقلمند کانسٹیبل سمجھتے تھے۔ اشرف علی اڑھائی سال سے اُس کے لئے مخبری کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے بیان میں اعتراف کیا کہ میرے دو چھاپوں کی قبل از وقت اطلاع اسی نے مینا تک پہنچائی تھی۔ اشرف علی کو اس کا بہت معاوضہ ملتا تھا۔ گھوڑی کی چوری اور رامے کھوجی کے قتل سے چند دن پہلے اشرف علی پانچ روزہ کی چھٹی گیا تھا۔ اس نے اقبالِ جرم میں بتایا کہ وہ مینا کے پاس اُس کے بلاوے پہ گیا تھا۔ اُس نے اُس گاؤں کا نام بتایا جہاں مینا کچھ دیر کے لئے ٹھہرا تھا۔

مینا نے اُسے ایک کام سونپا۔ یہ اس واردات کا دلچسپ پہلو ہے۔ جن دِنوں زمیندار شکار پر گیا تو نیلی آنکھوں والی لڑکی کے گاؤں سے گزرتے اُس کی نظر لڑکی پر پڑی تھی اور وہ اُس کے گھر چلا گیا تھا۔ انہی دِنوں مینا نے اِدھر سے گزرتے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ مینا نے اشرف علی کو بتایا تھا کہ لڑکی نے اُس کے پاؤں جکڑ لئے۔ وہ اُس وقت گاؤں سے کچھ دُور لڑکیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہی تھی۔ اُس نے لڑکی کو بُلایا۔ نام پوچھا۔ ان کے درمیان رسمی سی باتیں ہوئیں۔ مینا نے محسوس کر لیا کہ لڑکی نے بھی اسے پسند کر لیا ہے۔ دوسرے دن مینا پھر اُدھر گیا۔ وہ لڑکی کو بتا گیا تھا۔ لڑکی وہاں کھڑی تھی۔ اُس روز لڑکی نے مینا کی محبت قبول کر لی اور اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ مینا اُسی روز لڑکی کو اپنے

ساتھ لے جاتا لیکن مینا کو کہیں اور جانا تھا۔

لڑکی کے دل کا راز — مینا

اشرف علی کو مینا نے بتایا کہ ایک زمیندار (جس کی گھوڑی چوری ہوتی تھی) اور پیر حکیم صاحب بھی اس لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دونوں لڑکی کے گھر جانے لگے تھے۔ مینا نے اپنے کسی آدمی کو زمیندار کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم مینا کے دل پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم لڑکی کے گھر جانے سے باز نہ آئے تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ تمہیں کون قتل کر گیا ہے۔ زمیندار نے اس دھمکی کا جواب یہ دیا کہ چوروں کی طرح قتل کرنا مردوں کا کام نہیں، میرے سامنے آؤ۔ یہ جواب سن کر مینا نے اپنے دو آدمیوں سے کہا کہ جب میں کہوں اس لڑکی کو اس زمیندار کی گھوڑی پر سوار کرا کے لانا۔

مینا تین چار بار رات کے وقت لڑکی کے گاؤں گیا۔ لڑکی کو اشارہ معلوم تھا۔ مینا بھیڑیئے کی لمبی آواز نکالتا تھا جو سن کر لڑکی باہر آجاتی اور مینا سے ملتی تھی۔ اشرف علی کے اس انکشاف سے یہ راز کھلا کہ لڑکی کے ماں باپ کے بیان کے مطابق لڑکی تین چار بار رات کو باہر گئی اور دیر سے واپس آئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ زمیندار سے ملنے جاتی ہے۔ مینا کو کہیں دور جانا پڑا۔ اشرف علی کو معلوم نہیں تھا کہ مینا کہاں گیا۔ وہ واپس آیا تو اسے پتہ

چلا کہ لڑکی پیر حکیم صاحب کے گھر ہے۔ پیر کے گھر ایک عورت بھی جس کی زندگی جرائم میں گزر رہی تھی۔ اُس نے مینا کے لئے بہت کام کیا تھا۔ مینا کو معلوم تھا کہ یہ عورت پیر کے گھر ہے۔ رابطے کے کئی ذرائع تھے۔ مینا نے اس عورت کو پیغام بھیجا کہ لڑکی کو وہاں سے نکالو۔

اس عورت کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ پیر کے گھر مریدوں اور مریدنیوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ مینا نے اشرف علی کے ہاتھ رسہ بھجوایا کیونکہ عورت نے پیغام بھیجا تھا کہ لڑکی کو رات کو نکالا جا سکتا ہے اور وہ بھی رسّے کی مدد سے۔ ڈیوڑھی میں تین چار آدمی سوتے ہوتے تھے۔ لڑکی فرار کے لئے تیار تھی۔ وہ مینا کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ مینا کے آدمیوں نے عورت کے ساتھ رابطہ رکھا اور ایک رات طے کر لی گئی۔

پہلے زمیندار کی گھوڑی کھولنی تھی لیکن گھوڑی بند دروازے کے پیچھے ہوتی تھی۔ اندر ایک نوکر سوتا تھا۔ نوکر کو ڈیڑھ سو روپیہ (جو آج کے تین ہزار روپے کے برابر تھا) دیا گیا اور یہ وعدہ بھی کہ اُسے اگر زمیندار نے نوکری سے نکال دیا تو اُس کے روزگار کا اس سے اچھا انتظام کر دیا جائے گا۔ نوکر کا کام صرف یہ تھا کہ رات دروازے پر ہلکی سی دستک ہو تو وہ دروازہ کھول دے۔

چونکہ اس ساری سکیم کا ڈائریکٹر مینا تھا، اور مینا جرائم پیشہ تھا اس لئے سکیم کی ہر ایک کڑی پر نہایت خوبی سے عمل ہُوا۔ گھوڑی کھولنے کے لئے ایک آدمی گیا۔ نوکر نے دروازہ کھول دیا۔ گھوڑی بغیر زین کے

نکال لی گئی۔ کانسٹیبل اشرف علی چھٹی سے واپس آچکا تھا۔ اس سکیم میں اشرف علی کے ذمے یہ کام تھا کہ اگر زمیندار گھوڑی کی چوری کی رپورٹ تھانے میں کرے تو اشرف علی تفتیش میں ساتھ رہے اور مینا کو خبر پہنچاتا رہے، اور اگر ممکن ہو تو اشرف علی تفتیش کو غلط لائن پر ڈالنے کی کوشش کرے۔ مینا اور اشرف علی میرے طریقِ تفتیش سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میرے پاس گھوڑی کی چوری کی رپورٹ آگئی تو میں اسی وقت کھوجی کو ساتھ لے کر تفتیش کے لیے چل پڑوں گا۔ اس سکیم میں راما کھوجی کا قتل شامل نہیں تھا۔ مینا اتنی دور کی نہیں سوچ سکا تھا۔ تفتیش جب شروع ہوتی ہے تو تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آگے چل کر کیا ہو گا۔

لڑکی کے فرار کے متعلق مینا کو یقین تھا کہ پیر تھانے میں رپورٹ نہیں دے گا کیونکہ یہ لڑکی اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ پیر خود مجرم تھا۔ اس نے لڑکی کو حبسِ بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کھوجی کو صرف ایک کانسٹیبل کے ساتھ کھرا اٹھانے کے لئے بھیج دوں گا۔ یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ میں یہ اقدام بھی کروں گا، لہٰذا راما کھوجی کے قتل کی کسی نے سوچی بھی نہیں تھی۔

ہر کام سکیم کے عین مطابق ہوتا گیا۔ گھوڑی نکال لی گئی۔ زمیندار نے وقت ضائع کئے بغیر تھانے میں رپورٹ دی۔ میں نے اسی وقت عثمان کو دو کانسٹیبلوں کے ساتھ جائے واردات پر بھیج دیا۔ اشرف علی

کو معلوم تھا کہ گزشتہ رات گھوڑی اور لڑکی نکالی جائے گی۔ وہ اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے لئے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق زمیندار آگیا۔ اشرف علی نے وردی پہن لی تھی۔ عثمان نے دو کانسٹیبلوں کو بلایا تو اشرف علی نے آگے ہو کر کہا کہ میں جاؤں گا۔ یہ ذہین اور ہوشیار سپاہی تھا۔ عثمان نے اسی کو ساتھ لے جانا پسند کیا۔ عثمان رامے کھوجی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔

رامے کھوجی نے نہایت کامیابی سے کھرا اُٹھایا۔ اشرف علی کے بیان کے مطابق گاؤں سے باہر ایک آدمی کھڑا تھا۔ دوسرا آدمی نوکر کی مدد سے گھوڑی لے آیا اور باہر جو آدمی کھڑا تھا وہ گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ آپ ایک بار پھر پڑھیں کہ رامے کھوجی نے کیسے کھرا اُٹھایا اور عثمان کو کیا بتایا تھا۔ وہ حرف بہ حرف صحیح نکلا۔ گھوڑی کو گاؤں سے دو اڑھائی فرلانگ دُور دُور سے پیر حکیم صاحب کی بستی تک لے جایا گیا۔ ایک آدمی نے اُلّو کی آواز نکالی۔ چھت کی مُمٹی کے ساتھ رسّہ باندھا جا چکا تھا۔ عورت اور لڑکی چھت پر تھیں۔ لڑکی رسّے سے اُتر آئی اور بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی جہاں گھوڑی کھڑی تھی۔ اشرف علی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس عورت نے لڑکی کے جانے کے بعد رسّہ کیوں نہیں اُتارا اور وہ خود اس گھر سے کس وقت اور کس طرح نکلی اور غائب ہو گئی۔

اشرف علی نے اپنے بیان میں بتایا کہ جب میں عثمان کے بلانے

پر بیر کی چھت پر گیا اور نیچے آکر رامے کھوجی سے کہا تھا کہ وہ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر کھرا اُٹھاتا جائے، اُس وقت اشرف علی نے کہا کہ وہ کھوجی کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ اُسے بھیج دیا گیا۔ اپنے بیان کے اس مقام پر آکر اشرف علی نے اپنے بھیانک جُرم کا اعتراف کیا۔ اس نے بتایا کہ راما کھوجی بالکل صحیح کھُرے پر جا رہا تھا۔ وہ اُس ویرانے میں پہنچ گیا جہاں وہ قتل ہوا تھا۔ اشرف علی کے کہنے کے مطابق اُس وقت مینا وہاں سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر چھوٹے سے ایک گاؤں میں موجود تھا اور لڑکی اُس کے ساتھ تھی۔ اشرف علی کو معلوم تھا کہ مینا کو اس گاؤں میں آنا تھا۔ راما کھوجی کھُرا اُٹھاتے اُدھر ہی جا رہا تھا۔

ضمیر گناہ کا بوجھ نہ اُٹھا سکا

میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ جُرم گناہ بھی ہوتا ہے اور حماقت بھی۔ اشرف علی عقل والا کانسٹیبل تھا۔ اُس نے یہ نہ سوچا کہ راما کھوجی اُس گاؤں میں جہاں مینا تھا پہنچ جاتا تو مینا اسے غائب کر دیتا لیکن شرفو نے مینا سے زیادہ انعام لینے کی خاطر رامے کو قتل کر دیا۔ قتل اس طرح کیا کہ اُس کی گردن اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی۔ انگوٹھوں سے شہ رگ دبائی اور اُسے مار دیا۔ اُس نے لاش درختوں کے پتے اور شاخیں توڑ کر ان میں چھپا دی۔ اس جگہ سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ اور ٹ

بہت تھی۔ شرفو کو یقین تھا کہ رات کو بھیڑیے، گیدڑ اور لکڑ بگے لاش کو کھالیں گے۔ اس سے یہ پتہ ہی نہیں چلے گا کہ راما کس طرح قتل ہوا ہے۔ اشرف علی ادھر اُدھر ٹہلتا رہا، کہیں بیٹھا رہا اور شام کو اس گاؤں میں پہنچ گیا جس کے نمبردار اور آدمیوں کے ساتھ وہ تھانے آیا تھا۔ اُس نے یہ کہانی گھڑلی جو اُس نے مجھے سُنائی تھی کہ چار آدمیوں نے رامے کھوجی کو ڈنڈوں سے مار ڈالا ہے۔ اُس کی توقع کے عین مطابق میں جائے قتل پر گیا تو وہاں رامے کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ خون نہیں تھا۔ میں مان گیا کہ مقتول کو ڈنڈوں سے مارا گیا ہے اس لئے کوئی زخم نہیں ہوا۔ اشرف علی نے بتایا کہ اُس نے لاش کہیں اور چھپائی تھی۔ درندے وہاں سے گھسیٹ کر کہیں اور لے گئے تھے۔

اشرف علی نے قتل جیسا بھیانک جرم پہلی بار کیا تھا اس لئے اُس کا ضمیر برداشت نہ کرسکا۔ وہ نوکری سے بھاگ جانے کی سوچ رہا تھا۔ جرم کرنے تک وہ جرم پر سوار تھا اور خوش تھا کہ دُنیا اور آخرت کا قانون اُس کے ہاتھ میں ہے مگر جرم کے بعد جرم اُس پر سوار ہو گیا اور وہ پناہیں ڈھونڈنے لگا۔ عثمان نے اور میں نے جب اس کی دو تین کمزوریاں پکڑیں تو اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کی زبان ہکلانے لگی۔ گناہ کے بعد انسان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ جب عثمان نے اُسے گرا کر ڈنڈا اُس کے منہ میں ڈالا تو پانچ منٹ کے اندر اُس نے اقبالِ جرم اُگل دیا۔ یہ اس اذیت کا اثر نہیں تھا جو اُسے عثمان

نے دی تھی بلکہ یہ اُس اذیت کا اثر تھا جو اُس کا ضمیر اُسے دے رہا تھا۔

یہاں میں ایک اور وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میرے بعض قارئین سوچ رہے ہوں کہ مِینا نامی گرامی جرائم پیشہ تھا اور وہ اپنے فن کا استاد بھی تھا، پھر اُس نے یہ حماقت کیوں کی کہ زمیندار کی گھوڑی چرائی اور اس پر لڑکی کو اغوا کرایا۔ کیا مِینا کسی اور گھوڑی کا انتظام نہیں کر سکتا تھا؟ — غرض یہ ہے کہ مِینا ایک درجن گھوڑوں کا انتظام کر سکتا تھا، اور اُس کے اپنے گھوڑے بھی تھے لیکن اُس نے زمیندار کو چیلنج کیا تھا کہ وہ اُسی کی گھوڑی پر لڑکی کو اپنے پاس لائے گا۔ یہ اُس دَور کے ڈاکوؤں وغیرہ کا دستور تھا کہ جو انہیں للکارے اُس پر وہ للکار کر حملہ کیا کرتے تھے۔ وہ پولیس تک کو چیلنج کیا کرتے تھے۔ زمیندار نے مِینا کو للکارا تھا۔ اس کے جواب میں اُس نے وہی کیا جو اُس نے کہا تھا۔

میں نے اشرف علی کا مکمل اقبالی بیان لکھ کر اُسے حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے دن اُسے عثمان کے ساتھ پندرہ میل دُور ضلع کچہری میں مجسٹریٹ کے پاس بھیج دیا جس نے اس کا پورا بیان قلمبند کر لیا۔ اُسے سلطانی گواہ بنانے کی بھی قانونی کارروائی مکمل کر لی گئی اور اُسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔

اب میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ مِینا کی گرفتاری کا تھا۔ میں اسے نظر انداز بھی کر سکتا تھا۔ مجھے راما کھوجی کا قاتل مل گیا تھا۔

میں اسی پر کیس ختم کر سکتا تھا لیکن میں نے اور عثمان نے تہیہ کر لیا کہ اب کے مینا کو پکڑنا ہے۔ اشرف علی نے ہمیں بڑا صاف اشارہ دے دیا تھا کہ ان دنوں مینا کہاں ہوگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ان دنوں نیلی آنکھوں والی لڑکی کے ساتھ مگن ہوگا۔ میں نے بہروپ میں مخبر بھیجے۔ میں نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ اگر انہوں نے دھوکا دیا تو میں ان کے سارے خاندان کو گرفتار کر لوں گا۔ مخبر چلے گئے تو میں گھوڑی کے مالک (زمیندار) کے گھر چلا گیا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُسے مینا نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ اس لڑکی سے توجہ ہٹا لے ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ زمیندار نے پیغام کا وہی جواب دیا تھا جو اشرف علی نے بتایا تھا۔ زمیندار نے اس کی تصدیق کی کہ مینا نے اُسے دھمکی بھیجی تھی کہ لڑکی کو وہ اسی کی گھوڑی پر لے جائے گا۔

"میں اسے گیدڑ بھبکی سمجھا تھا" — زمیندار نے کہا — "لیکن گھوڑی چوری ہو گئی تو میں ڈر گیا۔ میں نے دانستہ مینا کا نام نہیں لیا تھا، بے ڈر تھا کہ مینا کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے قتل کرا دے گا۔"

مینا کا جشن ہمارا چھاپہ

زمیندار کی اس حماقت پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اگر وہ پہلے بتا دیتا تو میرا کھوجی قتل نہ ہوتا۔ میں نے اُسے بتایا کہ چوروں کا ساتھی اُس کے

گھر میں موجود ہے۔ میں نے اُس کے نوکر کو گرفتار کر لیا۔ تھانے میں آکر اُس نے اقبالِ جُرم کر لیا۔ اس دوران ہم نے قتل کا کیس مکمل کرنے کے لیے کاغذی کارروائی اور اشرف علی کے بیان کے مطابق شہادتوں کی فراہمی کا کچھ کام کر لیا.... اُسی رات یا شاید اگلی شام تھی کہ ایک مخبر آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ مِینا ایک جگہ جشن منا رہا ہے۔ یہ چٹانوں کے درمیان چند ایک جھونپڑا نما مکانوں کا گمنام سا گاؤں تھا۔ چٹانیں ہری بھری تھیں۔ میں نے یہ جگہ کئی بار دیکھی تھی۔ خوبصورت جگہ تھی۔ اس سے پہلے بھی مجھے پتہ چلا تھا کہ مِینا کبھی کبھی یہاں آتا ہے۔ گاؤں کے لوگ کھیتی باڑی اور محنت مزدوری کرتے تھے لیکن یہ مشکوک لوگ تھے۔

میرا مُخبر دوسرے مخبر کو اسی علاقے میں چھوڑ آیا تھا تاکہ وہ مِینا پر نظر رکھے اور وہ کہیں اور چلا جاتے تو اُس کا تعاقب کیا جا سکے۔ یہ گاؤں تقریباً سات میل دُور تھا۔ چھاپے کا موزوں وقت آدھی رات کے بعد کا تھا۔ اُس وقت انسان کی نیند گہری ہوتی ہے۔ میں گھوڑوں کا انتظام کر سکتا تھا لیکن مجھے خاموشی قائم رکھنی تھی جو گھوڑوں اور ٹٹوؤں کے ساتھ ہونے سے ممکن نہیں تھی۔ میں نے بارہ کی نفری ساتھ لی۔ ان میں ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی تھا۔ ان سب کے پاس ۰اہم بور کی مسکٹ رائفلیں تھیں۔ ان کے راؤنڈوں میں چھرّے ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ عثمان بھی تھا۔ ہم دونوں کے پاس ریوالور تھے۔ ساتھ کافی ایمونیشن لے لیا اور ہم رات گیارہ بجے روانہ ہوتے۔ تھانے سے ہم ایک ایک

کر کے بہت فاصلے اور وقفے سے نکلے تاکہ مِینا کا کوئی مخبر دیکھ رہا ہو تو اُسے شک نہ ہو۔ گاؤں سے دُور جا کر ہم اکٹھے ہوتے۔ عثمان ہنسی مذاق کے مُوڈ میں تھا۔ اس سے پیدل سفر آسان ہو گیا۔ کانسٹیبل بھی گپ شپ لگاتے جا رہے تھے۔ میں نے رفتار ذرا سُست رکھی۔ میں رات کے آخری پہر وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

چاندنی شفاف تھی۔ ہم دو بجے کے لگ بھگ اپنے ٹارگیٹ پر پہنچے۔ میں نے نفری کو ضروری ہدایات دے کر محاصرے کے لئے پھیلا دیا مگر گاؤں کے قریب گئے تو ایک گولی فائر ہوئی۔ ہم سب نے پوزیشنیں لے لیں۔ میں سمجھ گیا کہ مِینا نے پہرہ بیدار رکھا ہُوا ہے اور یہ گولی اُسے خبردار کرنے کے لئے اُس کے کسی آدمی نے فائر کی ہے۔ میرے ایک کانسٹیبل نے گھبرا کر فائر کر دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بلند آواز سے کہا —— "حکم کے بغیر گولی مت چلاؤ" — یہ میری پارٹی کی دوسری غلطی تھی۔ دشمن بیدار ہو گیا۔ یہ یقین ہو گیا کہ مِینا یہیں ہے۔ میں نے اور عثمان نے دوڑ دوڑ کر کانسٹیبلوں کو اچھی پوزیشنوں میں کر دیا اور انہیں بتا دیا کہ اب گاؤں میں کوئی سایہ بھی نظر آ جائے تو اُس پر گولی چلا دو لیکن گولی ضائع نہ جائے۔

مِینا کے آدمی بیوقوف معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں کچے پکے جھونپڑوں کی چھتوں پر تین چار آدمی چڑھتے دکھائی دیئے۔ چاندنی میں وہ دُور سے بھی نظر آ رہے تھے۔ یکلخت کئی گولیاں فائر ہوئیں۔ یہ میرے

کانسٹیبلوں کی گولیاں تھیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد چھت پر کوئی حرکت نہ ہوئی۔ میں الگ اور عثمان الگ گاؤں کے اردگرد تیز تیز گھومتے اور کانسٹیبلوں کو ہدایات اور حوصلہ دیتے پھرتے تھے۔ یہ کوئی قلعہ یا بہت بڑا گاؤں نہیں تھا۔ چند ایک جھونپڑے سے تھے جنہیں میرے بارہ آدمیوں نے اچھی طرح محاصرے میں لے رکھا تھا۔ چاندنی فائدہ دے رہی تھی۔ پانچ سات منٹ بعد گاؤں سے ایک دو گولیاں فائر ہوتی تھیں پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔

میں نے بلند آواز سے کہا۔ "ملنے باہر آجاؤ۔ اب تم زندہ نہیں نکل سکو گے۔ گاؤں ایک سو سپاہیوں کے گھیرے میں ہے۔"

"آگے آؤ ملک!" ۔ اُدھر سے للکار سنائی دی۔ یہ مینا بول رہا تھا۔ "مسلمان کے بچے ہو تو سامنے آؤ اور مجھے زندہ پکڑ لو۔"

تھوڑے تھوڑے وقفے سے کبھی میں مینا کو للکارتا کبھی عثمان اور کبھی مینا ہمیں للکارتا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میرا گھیرا مکمل اور مضبوط ہے اور مینا یہاں سے نہیں نکل سکے گا۔ میں نے گاؤں والوں کو بلند آواز سے کہا۔ "تمام لوگ گھروں کے اندر رہیں جو باہر نکلے گا مارا جائے گا۔"

میں نے عثمان سے کہا کہ بچ بچ کر کانسٹیبلوں کے پاس جاؤ اور سب سے کہو کہ آڑ دیکھ کر آگے بڑھنا شروع کریں اور گاؤں کے قریب ہو جائیں...

چاروں طرف ہر ایک کانسٹیبل کے پاس جانے میں خاصا وقت لگ گیا۔ عثمان ہر کانسٹیبل کو خود آڑ دکھا کر آگے بڑھا رہا تھا۔ وہاں درخت بھی تھے اور

اتنے بڑے بڑے پتھر بھی جن کے پیچھے ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔

ہم آگ میں کود گئے

مجھے بہت دیر تک عثمان نہ ملا۔ میں ایک ایک کانسٹیبل کو تلاش کرتا ہر ایک سے پوچھنے لگا کہ عثمان کہاں ہے؟ ہر کسی نے کہا — "اُدھر چلا گیا ہے" — میں نے دو چکر کاٹے۔ عثمان نظر نہ آیا۔ ہیڈ کانسٹیبل مل گیا۔ کہنے لگا — "عثمان صاحب گاؤں کے اندر چلے گئے ہیں۔ میں بھی جا رہا ہوں" — اور وہ دوڑ کر جھونپڑوں میں غائب ہو گیا۔ میں نے عثمان کو ایسی ہدایت نہیں دی تھی۔ اُس نے خود ہی خطرہ مول لیا تھا۔ میں احمقوں کی طرح وہاں کھڑا دیکھنے لگا کہ اب کیا ہو گا۔ گاؤں کا قریبی جھونپڑہ مجھ سے کوئی بیس قدم تھا۔ میں دوڑ کر دیوار کے ساتھ ہو گیا۔ دیوار کا سایہ تھا۔ میں آگے کو سرکنے لگا۔

اندر سے مجھے عثمان کی آواز سنائی دی۔ میں دروازے کی طرف گیا اور آہستہ سے عثمان کو آواز دی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ اُس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی ٹارچ تھی۔ اندر سہمی ہوئی ایک عورت اور آدمی کھڑے تھے۔ ان کے بچے بے خبری کی نیند سوتے ہوئے تھے۔ عثمان ان سے پوچھ چکا تھا کہ مینا کس مکان میں ہے۔ عثمان کو اس آدمی نے جو جوا[illegible]تھا وہ اس نے مجھے بتایا۔ میں نے اس آدمی سے

کہا کہ ہمارے ساتھ باہر آؤ۔ اُس نے بتایا تھا کہ مینا کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ عثمان نے پوچھا "اُس کی آنکھیں نیلی ہیں؟" —— اس آدمی نے جواب دیا کہ ہاں نیلی ہیں۔

اس آدمی کے ساتھ ہم دیواروں کے سائے میں مینا والے مکان کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے جو عثمان کے ساتھ تھا کہا کہ وہ گاؤں سے باہر کانسٹیبلوں کو اپنی کمانڈ میں لے لے اور میری پکار پر حملہ کرائے۔ ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا۔ ہم آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک گولی فائر ہوئی جو ہمارے درمیان سے گزر کر کچی دیوار میں لگی۔ ہم بیٹھ گئے اور تیزی سے سرکتے ایک اور دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ چاندنی میں کوئی بیس قدم دُور ہمیں ایک آدمی نظر آیا جس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ بدنصیب شخص ہمیں دیکھنے آیا تھا۔ عثمان نے اطمینان سے ریوالور فائر کیا۔ وہ آدمی رُک گیا۔ اُس کی آواز نہ نکلی پھر وہ گر پڑا۔ ہمارے ساتھ جو آدمی تھا وہ بُری طرح ڈر رہا تھا۔ ہم آگے بڑھنے سے ڈر رہے تھے۔ کچھ اور آگے بڑھے تو دو تین گولیاں فائر ہوئیں۔ ہم رُک گئے۔

صبح طلوع ہونے لگی۔ دن کی روشنی ہمارے لیے خطرناک تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے بارہ کانسٹیبلوں کے مقابلے میں گاؤں میں کتنے آدمی ہیں۔ وہ مکانوں کے مورچوں میں تھے اور ہم بالکل سامنے۔ عثمان نے بڑے شگفتہ انداز میں کہا "فکر نہیں ملک صاحب! اس (مینا) نے للکارا تھا کہ مسلمان کے بچے ہو تو سامنے آؤ۔ دن چڑھ رہا ہے۔ سامنے

جا کر پکڑیں گے۔"

عثمان کی خوش باش زندگی کی آخری صبح

عثمان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ اس کی خوش باش زندگی کی آخری صبح ہے۔ اگر مجھے غیب سے اشارہ مل جاتا تو میں محاصرہ اٹھا لیتا، مینے کو بھاگ جانے دیتا، عثمان کو نہ مرنے دیتا۔

صبح روشن ہو گئی۔ ہم نے وہ مکان دیکھ لیا جس میں مینا تھا۔ میں اب ایک ایک قدم کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ کہانی بہت لمبی ہو گئی ہے۔ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ میرے کانسٹیبل بے تحاشہ فائر کر رہے تھے۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ مینا کے ساتھیوں کے پاس رائفلیں کم ہیں۔ میں نے عثمان سے کہا کہ محفوظ طرف سے جاؤ اور چار پانچ کانسٹیبلوں کو ساتھ لے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد پانچ کانسٹیبل آ گئے۔ ہم نے اُس مکان پر حملہ بولا جس میں مینا تھا لیکن دائیں بائیں کی گولیوں نے ہمیں روک لیا۔ عثمان نے ریوالور کی گولی سے ایک آدمی کو ایک درخت میں سے گرایا۔ دو کانسٹیبل ایک مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ باہر سے ہیڈ کانسٹیبل نے فائرنگ جاری رکھی۔

اچانک شور اٹھا۔ چند ایک آدمی برچھیاں اور تلواریں لے کے نکل آتے تھے۔ میں نے، عثمان نے اور کانسٹیبلوں نے گولیاں چلائیں

اور کبھی ایک کو گرا لیا۔ ہم کچھ بکھر گئے۔ میری توجہ کسی اور طرف تھی۔ مجھے اپنے پیچھے 'آہ' جیسی آواز سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو مجھے چکر آ گیا۔ مینا کے ایک آدمی کی برچھی عثمان کے پیٹ میں اُتری ہوئی تھی اور عثمان دوہرا ہو گیا تھا۔ میں نے اس آدمی پر ریوالور فائر کیا۔ وہ گر پڑا۔ اُس کی برچھی عثمان کے پیٹ میں رہی۔ عثمان گر پڑا۔ میں نے برچھی نکال لی لیکن برچھی پیٹ میں نہیں دل میں اُتر گئی تھی۔ عثمان تنومند جوان تھا۔ گہرا لال خون چشمے کی طرح اُبل اُبل کر نکل رہا تھا۔

پھر میں نے نہیں دیکھا کہ گولیاں کدھر سے آتی ہیں، موت کہاں اور زندگی کہاں ہے۔ یُوں سمجھئے کہ میں پاگل ہو گیا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو کیا احکام دیئے تھے؟ انہوں نے تیزی سے عمل کیا یا سُستی سے؟ مجھے آج بھی یاد نہیں۔ یہ یاد ہے کہ میں چلاّ رہا تھا۔ باہر والے کانسٹیبلوں نے بھی (شاید میرے حکم پر) گاؤں پر ہلّہ بول دیا تھا۔ پھر مجھے یہ یاد آتا ہے کہ ایک گھوڑا دوڑا تھا۔ اس پر مینا اور اُس کے پیچھے لڑکی سوار تھی۔ گھوڑا دُور نہیں تھا۔ کانسٹیبلوں نے گولیاں چلائیں تو میں نے چلاّ کر کہا تھا ۔۔۔ "گھوڑے پر فائر کرو۔ سواروں کو زندہ رہنے دو۔"

گھوڑا زخمی ہو کر بے قابو ہُوا اور سرپٹ دوڑتا، بے قابو ہو کر گھومتا دُور سے ہنہناتا گاؤں میں آ گیا اور دوڑتے دوڑتے گر پڑا۔ مینا قلابازیاں کھاتا مجھ سے آٹھ دس قدم دور آ گرا اور لڑکی اس سے ذرا پرے گری۔ مینا جب اُٹھا تو میرے ریوالور اور دو کانسٹیبلوں

کی رائفلوں کی نالیاں اُسے گھیرے میں لے چکی تھیں۔ وہ گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کی جامہ تلاشی لی۔ اُس کی ناف سے پستول برآمد ہوا۔ نیلی آنکھوں والی لڑکی دوڑتی آئی اور مینا سے لپٹ گئی، پھر اُس کے جسم کا جائزہ لے کر بولی — "زخم زیادہ تو نہیں؟"

لڑکی کو جیسے معلوم ہی نہیں تھا کہ مینا پولیس کے گھیرے میں کھڑا ہے۔ اُس نے پیٹھ مینا کے سینے سے لگا کر ہمیں قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ گورا رنگ اور نیلی آنکھیں اور اس کے نقوش اپنی ماں کے سے تھے۔

"چلاؤ گولی" — لڑکی نے مجھے کہا — "ہم دونوں کو ایک ساتھ مار ڈالو۔"

میری انگلی میرے ریوالور کے ٹریگر کو آدھا پیچھے لے گئی تھی۔ میرے دل میں عثمان کے خون کا انتقام تھا مگر مجھے یاد آ گیا کہ میں تھانیدار ہوں۔ میں ذاتی طور پر ذاتی انتقام نہیں لے سکتا۔ میں نے ٹریگر سے انگلی نکال لی.... عثمان مر چکا تھا۔ مجھے ایک کانسٹیبل نے بتایا کہ عثمان میری جان بچاتے ہوئے مرا ہے۔ یہ کانسٹیبل دیکھ رہا تھا۔ اُس آدمی نے برچھی مجھ پر تانی تھی۔ میری اُدھر پیٹھ تھی۔ عثمان کہیں قریب تھا۔ اُس نے برچھی والے پر ریوالور فائر کیا لیکن گولی نہ چلی۔ اُس نے لمبی چھلانگ لگائی اور میرے اور برچھی کے درمیان آ گیا۔ برچھی عثمان کے دل میں اُتر گئی۔ میں نے بعد میں اُس کا ریوالور دیکھا۔ وہ چھ گولیاں فائر کر چکا تھا۔ ریوالور میں اور کوئی گولی نہیں تھی

اِس کے بعد جو کچھ ہوا وہ پولیس کی کارروائی تھی۔ مینا کے چار ساتھی اور گاؤں کے پانچ آدمی مارے گئے تھے۔ زخمی بہت ہوئے۔ مینا اور اُس کے دو ساتھیوں کو گرفتار کر کے میں انہیں گاؤں کے مردوں کے جلوس میں تھانے لایا۔ گاؤں کے لوگ گواہ تھے۔ جو گھوڑی ماری گئی تھی وہ زمیندار کی تھی۔ عثمان کی موت نے مجھے ذہنی طور پر اُدھ مؤا کر دیا تھا۔ مینا نے اقبالِ جرم نہ کیا اس لئے میں آپ کو اس کہانی کی گمشدہ کڑیاں نہیں سُنا سکتا۔ یہ صرف مینا جانتا تھا۔ لڑکی نے عدالت میں پیر اور زمیندار کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا تھا اور پوری طرح دلیری سے محبت کا ذکر کیا تھا مگر اس کی گواہی مینا کے خلاف گئی۔

اشرف علی وعدہ معاف گواہ تھا۔ اس نے بہت مدد کی۔ مینا کو قتل، رہزنی اور ڈاکے کی ان متعدد وارداتوں میں جن کے لئے وہ مطلوب تھا اور اشتہاری مجرم قرار دیا گیا تھا، سزائے موت اور اس کے ساتھیوں کو عمر قید (کالا پانی) دی گئی۔ گاؤں کے چھ آدمیوں کو پانچ پانچ سال سزائے قید دی گئی۔ زمیندار کے نوکر کو تین سال اور لڑکی کو اس کے ماں باپ کے حوالے کر دیا گیا۔ پیر حکیم صاحب کے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا تھا۔ اس کی پیری پہلے کی طرح چلتی رہی۔

میں نے کہانی کی ابتدا میں کہا ہے کہ دُنیا کے قانون کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، خُدا کے قانون سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اشرف علی

وعدہ معاف گواہ تھا اس لئے اسے سزا نہ ملی۔ اسے پولیس کی نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ وہ گھر چلا گیا۔ پندرہ بیس روز بعد پتہ چلا کہ اشرف علی قتل ہو گیا ہے۔ میں نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ وہ میرے تھانے کے علاقے کا رہنے والا نہیں تھا۔ اُسے قتل کرنے والے نامعلوم افراد تھے جو پکڑے نہیں گئے تھے۔ وہ یقیناً مینا کے گروہ کے آدمی تھے۔